

چاندنی کا سفر

PDFBOOKSFREE.PK

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

گلہت عبداللہ

عرض ناشر

ساگر پبلشرز کی ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ آپ تک ایسی معیاری، اچھوتی اور نئی قلمی تخلیق اور ادبی کاوش پہنچائی جائے جو زندگی آمیز بھی ہو اور زندگی آموز بھی۔ جو قلب و ذہن کی تسکین کا سامان کرے، جس سے آپ میں عمل و حرکت کا کوئی داعیہ پیدا ہو اور جس سے آپ کے ذوق مطالعہ کی تشنگی کا مداوا ہو۔ اس سلسلہ میں ہمارے ادارہ کے کئی ایک خوبصورت ناول زیور طباعت سے آراستہ ہو کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچے اور داد تحسین وصول کی۔ آپ نے انہیں خوب سراہا اور بڑی پذیرائی بخشی۔ یہ آپ کی پسندیدگی کا نتیجہ ہے کہ ہم آپ کے لئے نئی نئی تخلیقات کا اہتمام کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

اپنی اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اب ہم ملک کی ایک معروف خاتون ناول نگار محترمہ نگہت عبد اللہ کے سات ناولوں کا ایک دلکش اور مہکتا گلہ ستہ آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ ان میں ایک حسین ناول ”چاندنی کا سفر“ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

محترمہ نگہت عبد اللہ محتاج تعارف نہیں۔ ناول کی دنیا کا جانا پہچانا نام ہے۔ محترمہ لکھنے میں اپنا خاص اسلوب رکھتی ہیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں اس کا حق ادا کر دیتی ہیں۔ یہ ناول بھی آپ کی دلفریب اور نظر افروز تخلیقی کاوش ہے۔ امید ہے ہماری یہ تازہ کاوش بھی پہلے کی طرح جسے ہم دیدہ زیب ٹائٹل اور عمدہ گیٹ اپ کے ساتھ آپ کے خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی اور آپ اسے پذیرائی بخشیں گے۔ اپنی قیمتی آراء سے ضرور مطلع فرمائیں۔

منیجر

ساگر پبلشرز، لاہور

چاندنی کا سفر



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

۔ نالے لٹی تے نالے کالی

آئینے میں اس کا عکس نظر آیا تو وہ شوخی سے گنگنایا۔ اور دوپٹے پر تیل مالتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کوڑکے۔ دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بالوں میں برش کرتے ہوئے اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ساتھ اور اونچی آواز میں گانے لگا۔

۔ نالے لٹی تے نالے کالی

وہ سمجھ گئی، اُس کے دراز قد اور کالی رنگت پر چوٹ کر رہا ہے۔ دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے سوچنے لگی۔

”خود تو شہزادہ گلخام ہے جیسے۔ شاید اس سے بھی زیادہ حسین سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔

سراسر خوش فہمی!“

”سجوا! ذرا بتانا تو میں کیسا لگ رہا ہوں؟“ آئینے کے پاس سے ہٹ کر اُس کے سامنے

کھڑا ہو کر پوچھنے لگا تو وہ یونہی سر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈارک براؤن پینٹ پر لائٹ

گئی۔

”سنو! غصہ مت کیا کرو۔ رنگت اور سیاہ پڑ جاتی ہے۔“

وہ اندر تک سلگ گئی۔ مزید اُس کی مسکراہٹ دل جلا رہی تھی۔ دل چاہا دوبارہ بیٹھ جائے اور چائے بنانے سے صاف انکار کر دے۔ لیکن جانتی تھی وہ اپنا کام کر دے بغیر کسی صورت یہاں سے نہیں ملے گا۔ اس لیے دل ہی دل میں اُسے بُرا بھلا کہتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

بچن میں ممانی جان پہلے سے موجود تھیں اُسے دیکھ کر قدرے تعجب سے پوچھنے لگیں۔

”تم ابھی سوئی نہیں بیٹا!“

”سوئے ہی جا رہی تھی کہ.....“ وہ رُک گئی۔ لاکھ اُس پر غصہ سہی، اُس کی شکایت نہیں

رہ سکتی تھی۔

”سرد نے اٹھا دیا ہوگا۔“

”نہیں ممانی جان! بس چائے ہی تو بنانی ہے۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”تو نواب صاحب! اب چائے پیس گے۔ اُس سے کہو، اگر ایسا ہی دل چاہ رہا ہے تو

خود بنالے، تمہیں بے آرام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”میں بنادیتی ہوں۔“ اُس نے جلدی سے کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھ دیا۔

”تم اُسے سرچڑھا رہی ہو بیٹا! آئندہ مشکل ہو جائے گی۔“

ممانی جان نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

جلدی سے رُخ موڑ کر ریک پر سے گم اٹھانے لگی۔

”اچھا بیٹا! پھر لائٹ بند کر دینا۔“

ممانی جان دودھ کا گلاس لے کر اندر چلی گئیں تو وہ خوشگوار احساس میں گھر کر چائے

بنانے لگی، پھر جب وہ چائے لے کر اندر آئی تو سرد وہاں موجود نہیں تھا۔ اُس نے برآمدے میں

نکل کر دیکھا۔ اُس کے کمرے سے ہلکے ہلکے گنگنانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ اُسی طرف چلی آئی۔

ممانی جان اور سرد رات میں بہت دیر سے لوٹے۔ اُس وقت وہ سونے کے لیے اپنی جگہ پر لیٹ چکی تھی۔ لیکن جب سرد کو کمرے میں آتے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ایک نظر اُس پر ڈال کر نانی اماں کے پٹنگ پر بیٹھ گیا اور اُن کا کندھا ہلاتے ہوئے بولا۔

”بڑی اماں! اتنی جلدی سو رہی ہیں آپ؟“

”جلدی کہاں، گیارہ سے اُوپر ہو گئے ہیں۔“ نانی اماں غنودگی میں بولیں۔

”بارہ تو نہیں بجے ناں۔ اٹھ کر بیٹھیں۔ آپ کو شادی کا احوال سناؤں۔“

”یہ احوال تم صبح بھی سنا سکتے ہو۔ انہیں نیند میں سے کیوں اٹھا رہے ہو؟“

وہ ناگواری سے بولی۔ اصل میں وہ خود بھی اس وقت سونا چاہتی تھی اور جانتی تھی کہ اس

وقت اگر وہ شادی کا احوال سنانے بیٹھ گیا تو ایک بجے سے پہلے نہیں اٹھے گا۔

”چلو! انہیں نہیں اٹھاتا۔“ وہ خلاف توقع اُس کے اتنی جلدی مان لینے پر حیران ہوئی

لیکن جب وہ نانی اماں کے پٹنگ سے اٹھ کر کرسی کھینچ کر اُس کے پٹنگ کے قریب بیٹھا تو وہ جلدی سے بولی۔

”میں بھی سونے جا رہی ہوں۔“

”تم سو جاؤ گی تو چائے کون بنائے گا؟“

”یہ چائے کا کون سا وقت ہے!“

”چائے کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ چلو اٹھو، ہری آپ۔ بڑی شدید خواہش ہو

رہی ہے۔“

وہ اطمینان سے اُس کے پٹنگ پر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بولا تو وہ منہ ہی منہ میں

بڑبڑانے لگی۔

”جتنی مرضی گالیاں دے لو۔ میں چائے ضرور پیوں گا۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے گالیاں دینے کی۔“ وہ بھناتی ہوئی چادر پھینک کر کھڑی ہو

”ظاہر ہے۔ مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں جلدی سوؤں بھی۔“

وہ حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، اُس کے کمرے سے نکل آئی۔

وہ سونے کے لئے لیٹی تو خاصی آزرده ہو رہی تھی۔ حالانکہ ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا۔ وہ تو اکثر ہی اُس کے سامنے دوسروں کی تعریف اسی طرح کیا کرتا تھا بلکہ اکثر اُس کا مذاق ہی اُڑاتا ہے۔ پھر بھی پتہ نہیں کیوں وہ اُس سے کچھ امیدیں وابستہ کر بیٹھی تھی۔ اس میں غلطی اُس کی نہیں تھی بلکہ نانی اماں اور خود ممانی جان اکثر ایسی باتیں کر جاتیں کہ وہ دل کو اُس کا تمنائی ہونے سے روک سکتی بلکہ اُس پر اپنا حق بھی سمجھنے لگی تھی۔ اور پھر یہ کوئی ایک دو دن یا برس دو برس کی بات تو نہیں تھی۔ وہ جب سے یہاں تھی تب سے ہی ایسی باتیں سنتی آرہی تھی۔

بہت چھوٹی سی تھی جب امی کا انتقال ہو گیا تھا اور جب ابو جی نے دوسری شادی کی۔ اس وقت نانی اماں اور ماموں جان اُسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اُس نے شعور کی سیڑھیاں چڑھی گھر میں طے کی تھیں۔ اور اس گھر کے مکینوں کو وہ اپنا سب کچھ سمجھتی تھی۔

ظاہر ہے امی اسے یاد نہیں تھیں۔ اور ابو جی نے کبھی پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔ بس کبھی کبھار بھولی سی رقم بھیج کر شاید اپنے ہونے کا احساس دلا دیتے تھے۔ آخری بار اُس نے جب وہ پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی، تب اُنہیں دیکھا تھا۔ وہ کسی کام سے کراچی آئے تھے تو یونہی کھڑے کھڑے اُس سے ملنے چلے آئے تھے۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں آئے۔ شروع شروع میں وہ اُنہیں یاد کرتی تھی۔ اور انتظار بھی کرتی کہ شاید پھر کبھی آئیں لیکن اُس کا انتظار، انتظار ہی رہا اور پھر وقت کی گرد نے بہت کچھ دھندلا دیا۔

بہر حال، وہ یہاں خوش اور مطمئن تھی۔ نانی اماں اور ماموں جان کے علاوہ ممانی جان بھی اُس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اور ان کی باتوں سے اُس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اُسے اپنی

دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوئی تو وہ لباس تبدیل کر کے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اور ابھی ممانی جان نے بات ایسی کر دی تھی کہ وہ اب براہ راست اُس کی طرف دیکھ بھی نہ سکی۔ ٹھکی پلکوں کے ساتھ بہت خاموشی سے چائے کا گنگ نیبل پر رکھا اور جانے لگی کہ اُس نے پکار لیا۔ وہ رُک گئی لیکن پلٹ کر نہیں دیکھا۔

”جا کہاں رہی ہو؟ بیٹھو ناں!“

”میں اب سوؤں گی۔“ وہ پلٹ کر دیکھے بغیر بولی۔

”سو جانا۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ کم از کم میرے چائے پینے تک تو بیٹھو۔“

وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔ تب اُس نے چائے کا گنگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اور دو تین سپ لینے کے بعد کہنے لگا۔

”پتہ ہے بھو! بڑی خالہ بھی راولپنڈی سے آئی ہوئی تھیں۔“

اس کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگا۔

”ان کی بیٹیاں سعدیہ اور نادیہ بھی ساتھ تھیں۔ میں نے ایک عرصے بعد انہیں دیکھا ہے۔“

”اور تمہیں افسوس ہو رہا ہوگا کہ اب سے پہلے اُنہیں کیوں نہ دیکھا۔“ وہ جل کر بولی۔

”واقعی!“ وہ اپنی دھن میں بولے گیا۔ ”تمہیں کیا بتاؤں، کتنی خوبصورت ہیں دونوں۔“

کل یا پرسوں بڑی خالہ یہاں آئیں گی، پھر تم خود ہی دیکھ لینا۔“

”دیکھ لوں گی۔“ وہ آہستہ آواز میں بولی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ممانی جان کی بات نے جو ایک نیا احساس بخشا تھا وہ اُس کی سنگدلی کی نذر ہو گیا۔ جیسے ہی اُس نے خالگ نیبل پر رکھا وہ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

”اُنوہ! تم تو جیسے اسی انتظار میں بیٹھی تھیں کہ میں مگ خالی کروں اور تم اٹھا کر چل

بہنونا چاہتی ہیں۔ پھر وہ کیسے نہ خواب سجاتی۔

لیکن سرد..... وہ ہمیشہ سے ہی پتہ نہیں جان بوجھ کر یا انجانے میں اُس کے خوابوں کو سمار کرتا آ رہا تھا۔ وہ اب تک اُسے سمجھ نہیں سکی تھی۔ کبھی اتنا مہربان اور کبھی ایک دم سے کٹھور بن جاتا۔ اور وہ نادان لڑکی اُس کی مہربانیوں پر خوش اور اُس کی سنگدلی پر آزرده ہو جاتی۔ اُس رات بھی وہ بہت دیر تک اُس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

☆☆☆

سرد کی بڑی خالہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ آئیں تو ممانی جان نے بھداصرار نہیں اپنے پاس روک لیا۔ سعد یہ اور ناد یہ کو کراچی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ پہلے بھی وہ یہاں آ تو چکی تھیں لیکن اُس وقت بہت چھوٹی تھیں اور بقول اُن کے، اُنہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ دونوں آتے ہی سرد کے سر ہو گئیں۔

”ہمیں کلفٹن لے چلو۔“

”بیٹا! ابھی تو آئی ہو، کچھ دیر بیٹھو۔ کھانا کھانے کے بعد اطمینان سے جانا۔“ ممانی جان نے کہا تو سعد یہ منہ بنائے ہوئے بولی۔

”خالہ جان! ہم بس چند دنوں کے لیے تو آئے ہیں۔ اور ان چند دنوں میں ہم ڈھنگ سے گھوم پھر بھی نہیں سکیں گے۔ جب تک کھانا تیار ہو گا تب تک تو ہم کلفٹن پہنچ بھی جائیں گے۔ اور رہی کھانے کی بات تو ہم وہاں کچھ بھی کھالیں گے۔“

”اور کیا!“ ناد یہ نے بہن کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”تمہاری مرضی، میں تو تمہارے بھلے کو کہہ رہی تھی۔“

ممانی جان نے بات اُن کی مرضی پر چھوڑ دی تو ناد یہ اُن کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی۔

”تو خالہ جان! آپ سرد سے کہیں ناں وہ ہمیں لے جائے۔“

”کیا کہہ رہا ہے وہ؟“

”موصوف کچھ اکر رہے ہیں۔“

”میرا خیال ہے، دھوپ کی وجہ سے منع کر رہا ہوگا۔ ٹھہرو! میں پوچھتی ہوں اُس سے۔“

ممانی جان نے وہیں سے سرد کو آواز دی تو دوسری آواز پر وہ چلا آیا۔

”بھئی دیکھو، یہ سعد یہ اور ناد یہ کیا کہہ رہے ہیں۔“ ممانی جان نے کہا تو وہ اُن دونوں

بہنوں کو دیکھتا ہوا بولا۔

”یہ دونوں اس وقت کلفٹن جانے کی بات کر رہی ہیں جبکہ میرا خیال ہے.....“

”تم اپنا خیال اپنے پاس رکھو۔ جو یہ دونوں کہہ رہے ہیں وہی کرو۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ کندھے اُچکاتے ہوئے بولا۔

”اگر ان دونوں کو دھوپ میں جلنے کا شوق ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ چلو جلدی کرو۔“

”ہم بالکل تیار ہیں۔ البتہ جو سے پوچھ لو۔ وہ بھی چلے تو۔“ ناد یہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

”وہ کہیں نہیں جاتی۔“ اُسے آتے دیکھ کر کہنے لگا۔

”جو! ہمارے ساتھ جا کر کیا کرے گی، چلو ہم لوگ چلتے ہیں۔“

اُس نے خاموشی سے اُسے اُن دونوں بہنوں کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا، پھر ممانی

جان سے کھانے کے بارے میں پوچھ کر چکن میں آ گئی۔

دوپہر میں کھانے کے بعد وہ یونہی کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے نانی اماں کے

پاس لیٹ گئی۔ وہ اُس وقت سوتی نہیں تھی۔ اکثر سلائی کڑھائی کا کام اُس وقت کیا کرتی۔ اس

وقت بھی اسے دوپٹہ مکمل کرنا تھا۔ اُس نے سوچا کچھ دیر لیٹ کر اُٹھ جائے گی۔ ممانی جان اپنی بہن

کے ساتھ پتہ نہیں سو گئی تھیں یا باتوں میں مصروف تھیں۔ اُس نے نانی اماں کی طرف دیکھا۔ وہ

سامنے دیوار پر نظریں جمائے جانے کن سوچوں میں گم تھیں۔

”نانی اماں!“ اُس نے ہلکے سے پکارا تو وہ ہوں کہہ کر اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔

ٹوٹا سا لگ رہا تھا۔

شام میں نہانے کے بعد وہ آگن میں کھڑی بال سلجھا رہی تھی، جب وہ تینوں آئے۔
سرد کے چہرے پر تھکن کے ساتھ کچھ بیزاری کے آثار بھی نظر آرہے تھے۔ چار پائی پر گرنے کے
انداز میں بیٹھا اور پھر ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹتے ہوئے بولا۔

”جو! چائے ملے گی؟“ اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی نادیا بول پڑی۔
”ہاں بھئی، بڑی شدید خواہش ہو رہی ہے چائے کی۔ ذرا فرسٹ کلاس سی چائے

پنانا۔“

”ایسا کرو نادیا! چائے تم ہی بنالو۔“ سرد بالوں میں انگلیاں پھنساتا ہوا بولا۔

”میں!!“ وہ یوں چیخی، جیسے اُس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

”کیوں، کیا تمہیں چائے بنانی نہیں آتی؟“

”آتی ہے، لیکن اس وقت سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”اتنی تھک گئی ہوں۔ کچن میں جانے کی بالکل ہمت نہیں۔“

سرد نے مزید اصرار نہیں کیا تو وہ گیلے بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی باندھ کر کچن میں چلی

گئی۔

پھر سرد یہ اور نادیا یہ دودن رہیں۔ اور ان دودنوں میں انہوں نے خوب اودھم مچائے
دکھا تھا کہ اُن کے جانے کے بعد ایک دم بہت زیادہ خاموشی کا احساس ہونے لگا۔ حالانکہ یہ گھر تو
سدا سے ایسا ہی تھا۔ بس دودن ہنگامہ کیا دیکھ لیا کہ سناتوں کا احساس ہونے لگا تھا۔

”تم کیسی لڑکی ہو؟“

سرد کو شاید پہلی بار اُس کے وجود کے گرد کھڑی خاموش دیواروں کا احساس ہوا تھا۔ اس

سے اُلجھ پڑا۔

”نہ ہنسنا بولنا، نہ کوئی تفریح، بات کر لو تو مجبوراً جواب دے دیتی ہو، ورنہ خود سے کوئی

”آپ کو نیند نہیں آرہی؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟ روزانہ تو آپ اس وقت سو جاتی ہیں۔“

”ہاں!“ ہاں کی صورت ان کے ہونٹوں سے طویل سانس خارج ہوئی۔ پھر کہنے لگیں۔

”میں سرد کے بارے میں سوچ رہی ہوں، جوان جہان لڑکیوں کو لے کر اکیلا نکل گیا

ہے۔“

”تو کیا ہوانانی اماں؟“ وہ بظاہر عام سے لہجے میں بولی، ورنہ تو اُسے بھی یہ بات کھٹک

رہی تھی۔

”نہیں بیٹا! یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اور ان لڑکیوں کو تو دیکھو، کیسے اُس کے ساتھ چل

پڑیں، اماں نے بھی منع نہیں کیا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

”تم کیوں نہیں گئیں اُن کے ساتھ۔“

”ارے!“ وہ ہنس پڑی۔ ”ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں، یہ اچھی بات نہیں ہے۔“

”تم بے وقوف ہو۔“ نانی اماں خجالت مٹانے کو اُسے ڈانٹنے لگیں۔

”تمہیں سرد کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ ابھی سے ادھر ادھر تاک جھانک میں لگ گیا تو۔“

”بس کریں نانی اماں!“ وہ اُلجھ کر بولی۔ ”میرا اُس پر کیا اختیار!“

”ارے واہ! اختیار کیسے نہیں ہے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارے ماموں جان تمہارے

بارے میں کیا سوچے ہوئے ہیں۔“

”کک۔ کیا سوچے ہوئے ہیں؟“ وہ بوکھلا کر پوچھنے لگی۔

”وہ تم دونوں کی شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔“

نانی اماں نے اُس کی ٹھوڑی بھٹو کر اپنے طور پر اُسے خوشخبری دی تھی۔ لیکن وہ ایک دم

خاموش ہو گئی۔ نہ دل زور سے دھڑکانہ کوئی خوشگوار احساس جاگا۔ اس کے برعکس اندر ہی اندر کچھ

بات کرنی سیکھی ہی نہیں۔ مجھے تو تمہارے زندہ ہونے پر شبہ ہونے لگا ہے۔ سچ بتاؤ، تم اُسکتی نہیں ہو، تمہیں گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ سارا دن ہونٹ سیے رکھتی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے، سارا دن جو کچھ نہ کچھ سیتی رہتی ہو، تو ان کے ساتھ ساتھ اپنے ہونٹوں کو بھی سی لیا ہے۔“ وہ حیران تھی کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس کی طرف دیکھے گئی۔

”کیا تمہارے دل میں کوئی خواہش نہیں جاگتی؟“ وہ اُس کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”دل ٹیکس چاہتا کہ اپنی ہجولیوں میں اٹھو بیٹھو۔ قہقہے لگاؤ یا نانی اماں کے ساتھ رہ رہ کر اُن کی بوڑھی روح تمہارے اندر بھی ساگنی ہے۔“
”نہیں تو۔“ وہ بے خیالی میں کہہ گئی۔
”کیا نہیں تو۔“

”میرا مطلب ہے، میری کوئی ہجولی کوئی دوست ہی نہیں، پھر میں کس کے ساتھ.....“
”دوست بنانے سے بنتی ہے۔“ وہ اُس کی بات کاٹ کر بولا۔
”اُس پاس کتنی لڑکیاں ہیں، وہ جب بھی آتی ہیں تم اپنے کاموں میں مصروف رہتی ہو۔ وہ دیواروں سے باتیں کرنے تو نہیں آتیں۔ اور میرا خیال ہے اب تو سب نے آنا بھی چھوڑ دیا ہے۔“

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔
”سراسر تمہارا قصور ہے۔ ایسی بیزار شکل بنائے رکھتی ہو کہ وہ سمجھتی ہوں گی، تمہیں اُن کا آنا ناگوار گزرتا ہے۔“
”نہیں تو۔“

”پھر وہی، نہیں تو۔“
”آخر تم خفا کیوں ہو رہے ہو؟“

”خفگی کی بات نہیں ہے کیا، کہ تمہاری موجودگی کے باوجود اس گھر کی فضا خاموش اور بے رنگ سی لگتی ہے۔ جبکہ میں نے تو سنا ہے کہ وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔“
قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

”سعدیہ اور نادیا کو نہیں دیکھا۔ کتنی زندہ دل لڑکیاں ہیں۔ دو دن یہاں رہیں، صرف دو دن اور گھر کے در و دیوار تک کھل اٹھے۔“

”تو سارا قصہ یہ ہے سرمد علی! کہ تم اُن دونوں کے جانے سے اُداس ہو۔“ اُس نے

سوچا۔

”کیا تم اُن دونوں جیسی نہیں بن سکتیں؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”نہیں!“

”کیوں؟“

”میں جیسی ہوں، ٹھیک ہوں۔ مجھے اپنی شخصیت پر کسی اور کا رنگ نہیں چڑھانا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر اُس کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔

وہ شاید خفا ہو گیا تھا کہ اُس سے بات کرنی ہی چھوڑ دی نہ اپنے کسی کام کے لیے کہتا۔ چائے تک خود بنانے لگا تھا۔ وہ اگر کسی وقت چائے بنا کر لے جاتی تو خاموشی سے کپ تھام لیتا۔ در نہ تو زبردستی اُسے بھی بٹھا لیتا تھا۔ اور جب تک چائے پیتا، اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اب نہ وہ شوخی، نہ وہ گنگناہٹیں۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اُس کی خفگی محسوس نہیں کر رہی تھی بلکہ وہ تو بہت ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ اپنے آپ سے الجھتی رہتی کہ کیوں اُسے خفا کیا۔ اُس کی بات مان کیوں نہ لی۔ لیکن یہاں وہ اپنی نفی کرتی جاتی کہ اُس کی ہر بات مان سکتی ہے ایک یہی نہیں۔ آخر وہ کیوں اپنی شخصیت مسخ کر دے۔ وہ جیسی ہے، ٹھیک ہے اور وہ کیوں اُس کے اندر کسی اور کو کھوج رہا ہے۔ اگر ایسا ہی شوق ہے، اس گھر کی خاموش فضاؤں میں جلت رنگ بجوانے کا تو نادیا اور سعدیہ کو لے آئے۔ آخر میں وہ تلخ ہو کر سوچتی تھی۔

”تم کل تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔“

ابو جی چلے گئے تو وہ نانی اماں کی گود میں سر رکھ کر رو پڑی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ ابو جی کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی تو ہمیشہ سے یہ خواہش رہی کہ وہ پرانے گھر میں ابو جی کے ساتھ رہے لیکن ساتھ ہی وہ نانی اماں، ماموں جان اور ممانی جان سے دور بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ یہ گھر جس نے اُسے تحفظ دیا تھا اور جہاں نہ کبھی اجنبیت کا احساس ہوا اور نہ کبھی کسی نے یہ بتایا کہ وہ اُس گھر کی لڑکی نہیں ہے۔ اور پھر وہ تنگ بھی تو یہیں تھا جسے وہ انجانے میں اپنا سب کچھ بیٹھی تھی۔ اور جو پچھلے کئی دنوں سے خفا ہو کر اُس کی جان پر بنائے ہوئے تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی۔

”بیٹا! اگر تم نہیں جانا چاہتے تو اپنے ابو جی کو صاف منع کر دینا۔“

نانی اماں، ماموں جان اور پھر ممانی جان نے بھی یہی بات کہی اور یہی ایک بات صرف اُس کے منہ سے سُنے کے لیے وہ رات میں بہت خاموشی سے اُس کے کمرے میں چلی آئی۔ اُسے دیکھ کر وہ رُخ موڑنا چاہتا تھا کہ وہ ہمت کر کے اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”تمہیں پتہ ہے آج میرے ابو جی آئے تھے۔“ بغیر کسی تمہید کے بولی۔

”ہاں!“ وہ لا پرواہی سے جواب دے کر وہیں کرسی پر ڈھس گیا۔

”پھر تو تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ مجھے لینے آئے ہیں۔“ وہ ایک دم سر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اُس کے علم میں یہ بات نہیں تھی، جب ہی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ غیر یقینی بھی سمٹ آئی تھی۔

”کیا میں اُن کے ساتھ چلی جاؤں؟“ اُس نے اُسے امتحان میں ڈال دیا کہ فوری طور پر وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔

”بتاؤ ناں سرمد، میں چلی جاؤں؟“

”تمہاری مرضی!“ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہاری خواہش پر منحصر ہے۔ یہاں رہنا

ممانی جان اور پھر نانی اماں بھی سرمد کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کرنے لگیں۔ ایک وہی تو تھا جو اونچی آواز میں بولتا اور بات بے بات ہنسنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ اب وہی خاموش ہو گیا تھا تو ممانی جان اور نانی اماں کی تشویش فطری بات تھی۔ پہلے اُسے کریدتی رہیں کہ آخر اُسے کیا ہو گیا ہے؟ وہ کیوں اتنا خاموش رہنے لگا ہے؟ وہ گول مول سا جواب دیتا۔ کام زیادہ ہے تھک جاتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ پتہ نہیں دونوں خواتین اُس کے جواب سے مطمئن ہوتی تھیں یا نہیں۔ اب نانی اماں بیٹھے بیٹھے اس قسم کی باتیں کرنے لگیں۔

”پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے بچے کو، جانے کس کی نظر لگ گئی ہے؟“

”کسی کی نظر نہیں لگی۔ اُسے سعدیہ یاد دلاتی ہیں۔“

وہ جل کر سو جتی اور اُن دنوں وہ نانی اماں کی ایسی باتوں سے اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہوئے راہ فرار ڈھونڈ رہی تھی کہ ایک لمبے عرصے بعد ابو جی آگئے۔ پتہ نہیں اُنہیں اس کی یاد کیسے آ گئی تھی۔ اور وہ کیونکر اُس کی محسوس کرنے لگے تھے کہ آتے ہی کہنے لگے۔

”میں تمہیں لینے آیا ہوں بیٹا! تم میرے ساتھ چلو گے۔“

”مجھے؟ میں!!!“ وہ کتنی دیر تک اپنی طرف اشارہ کیے کھڑی رہی۔

”ہاں بیٹا!“ ابو جی کے مشفق لہجے پر وہ گھبرا کر نانی اماں کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیوں میاں رب نواز! یہ اتنے عرصے بعد تمہیں بیٹی کی یاد کیسے آئی؟“ نانی اماں کچھ طنز سے پوچھنے لگیں۔

”یاد تو ہمیشہ رہی۔ بس میں حالات سے مجبور تھا۔“ پھر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

بولے۔

”چلو گے ناں بیٹا!“

”نانی اماں اجازت دیں گی تب!“ وہ اپنا دامن بچا گئی۔

”تمہاری نانی اماں منع نہیں کریں گی۔“ ابو جی یقین سے بولے۔

مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

اگلے دن وہ بہت خاموشی سے اُسے جانے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ نانی اماں اُس کے جانے سے بہت اُداس تھیں اور بار بار اُن کی آنکھیں چھلکنے لگتیں تو وہ اپنا کام چھوڑ کر اُن کے پاس بیٹھ جاتی۔

”نانی اماں! آپ اس طرح روئیں گی تو میں کیسے جاسکوں گی۔“ وہ اُن کے آنسو پونچھتے ہوئے خود بھی آزرده ہو جاتی۔

”یہ تمہارے باپ کو بیٹھے بٹھائے پتہ نہیں کیا سوچھی۔ اچھی بھلی تو تم ہو یہاں۔“

”ایک نہ ایک دن تو مجھے جانا ہی تھا۔“ وہ اُسے آتے دیکھ کر بولی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ اپنے ابو جی کے ساتھ نہ جاتیں تو کوئی اور لینے آ جاتا۔ کیوں بڑی اماں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟“

وہ تائیدی نظروں سے نانی اماں کی طرف دیکھنے لگا تو وہ پُرسوج انداز میں سر ہلانے

لگیں۔

شام میں ابو جی آئے تو وہ ابھی ماموں جان کے ساتھ بیٹھے تھے کہ وہ اندر آ کر اپنا چیک شدہ سامان چیک کرنے لگی۔ سامان کیا تھا، بس ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ اور اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سب کچھ یہیں چھوڑے جا رہی ہو۔

”کیا رہ گیا ہے؟“ وہ جھنجھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اور اسی وقت وہ بہت خاموشی سے

اندر چلا آیا۔

”تو تم جا رہی ہو؟“ پتہ نہیں کیا تھا اُس کے لہجے میں کہ وہ بہت خاموشی سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گا لیکن تمہیں واپس یہیں آنا ہے۔“

”میں اب یہاں نہیں آؤں گی۔“ وہ خواہ مخواہ بیگ کھول کر اُس کے اندر جھانکنے لگی۔

چاہو یا اُن کے ساتھ جاؤ۔“

”تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟“ وہ ہاتھوں سے پھسلتی آس کی دُور کا آخری سرا مضبوطی سے تھامتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”مجھے کیا فرق پڑے گا؟“ وہ پتہ نہیں کیوں ہنسا تھا۔

”ہاں! تمہیں کیا فوٹ پڑے گا بھلا۔“ ایک عمر کا ضبط جواب دے گیا اور وہ پھٹ

پڑی۔

”تمہارے نزدیک میری اہمیت ہی کیا ہے۔“ ٹھن تو چلتی پھرتی زندہ لاش ہوں۔ نہ ہنسنا

نہ بولنا، نہ کوئی تفریح اور تم سمجھتے ہو، میرے اندر کوئی خواہش ہی جنم نہیں لیتی۔ نہیں سرمد علی! میرے سارے احساسات زندہ ہیں، تمام تر خواہشات سمیت۔ مزید جانا چاہتے ہو تو سنو! میں برس برس سے اپنے اندر تمہاری ہمراہی کی خواہش لیے پھرتی ہوں۔ تمہاری کج ادائیگوں کے باوجود، کبھی اس خواہش کا گلا نہیں گھونٹا۔ اور تم کہتے ہو میرے جانے نہ جانے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ قدرے توقف کے بعد تلخی سے بولی۔

”ٹھیک کہتے ہو تم۔ تمہیں بھلا میرے خاموش وجود سے کیا سروکار ہو سکتا ہے، تمہیں تو ہنسنے کھلکھلاتے، بے باک لوگ متاثر کرتے ہیں جو سارے لحاظ بھلا کر سناری حدیں پھلانگ جائیں۔“

وہ بند ٹھی ہونٹوں پر جمائے ایک ٹک اُسے دیکھے گیا۔

”میں بھی ہنسنے کی خواہش رکھتی تھی۔ لیکن کبھی تم نے مجھے ہنسنے دیا؟ ہمیشہ میری کم روی کا مذاق اڑا کر مجھے آزرده کرتے رہے۔ میری رنگت، میری آنکھیں، میری خاموشی کس کس کو نشانہ نہیں بنایا تم نے۔ اور اب الزام بھی مجھے دیتے ہو!“

اُس کی آواز بھرا گئی تھی۔ جب ہی خاموش ہو کر اُس کی طرف سے رُخ موڑ لیا۔ اور پھر اُسی طرح اس کے کمرے سے نکل بھی گئی۔ جبکہ وہ طویل سانس لے کر بیڈ پر گرا تو ایک خوبصورت

”اچھا!“ وہ اپنی کمی ہوئی بات سوچتے ہوئے بولا۔ ”وہ میں نے یونہی غصے میں کہہ دیا تھا۔ اصل میں جو بات میں تمہارے منہ سے برسوں سے سننے کا منتہی تھا وہ نادیدہ نے دودن میں کہہ دی تھی۔ اس لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اُن جیسی کیوں نہیں ہو۔“

”بہر حال، اب تو میں جا رہی ہوں۔“ جب سمجھ میں نہیں آیا کہ اُس کی بات کا کیا جواب دے تو جانے کی بات کرنے لگی۔

”ٹھیک ہے ضرور جاؤ، لیکن واپس تمہیں یہیں آنا ہے۔“

اُس نے جھکی نظروں کے ساتھ ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا اور بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل آئی۔ مزید اُس کے سامنے کھڑے رہنا خاصا مشکل تھا کہ دھڑکنوں نے تو انداز بدلا، چہرے پر بھی رنگوں کی برسات اُترنے لگی تھی۔ اور اس شوخ سے کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ پل میں سنجیدگی کا لبادہ اُتار کر چھیڑنے کھڑا ہو جاتا۔

صبح سے وہ نانی اماں سے بار بار یہی کہتی رہی تھی کہ اب دوبارہ یہاں کبھی نہیں آئے گی، لیکن جب ابو جی کے ساتھ جانے لگی تو نانی اماں سے گلے ملتے ہوئے اُن کے کان میں آہستہ سے بولی۔

”نانی اماں! میں جلد ہی واپس آؤں گی۔“ جواب میں نانی اماں نے ایسی آہ بھری کہ وہ بس انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

یہ شاید وہی گھر تھا جہاں اُس نے کچھ وقت امی کی آغوش میں گزارا تھا۔ گو کہ اُسے کچھ یاد تو نہیں تھا۔ پھر بھی اس گھر پر ایک دوسری عورت کی حکمرانی نے اُسے احساسِ محرومی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ اور اندر ہی اندر کچھ خوفزدہ بھی تھی کہ پتہ نہیں اس گھر میں اُس کا کیا مقام ہو۔ اور دوسرے وہ عورت، اُس کے ساتھ کیا سلوک کرے لیکن اس وقت وہ خوف سے نکل آئی جب اُس دوسری عورت نے کھلے دل سے اُسے خوش آمدید کہا اور خود سے بڑھ کر گلے لگایا۔ چھوٹے بہن بھائیوں

”میں لینے آؤں گا تب بھی نہیں؟“ وہ چکر کاٹ کر اُس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”تم کیوں لینے آؤ گے؟“

”ظاہر ہے، تمہارے جانے سے یہاں۔۔۔۔۔“

”کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔

”فرق پڑے گا جوا!“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور بیگ پر نکلے اُس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ

رکھتا ہوا بولا۔

”میرا خیال تھا تم مجھے سمجھتی ہو گی، لیکن تم نے تو ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ میری چھیڑ

چھاڑ، میری شوخیوں کو طنز پر محمول کرتی رہیں۔ میں نے کبھی تمہارا مذاق نہیں اڑایا۔ جوا! تم ہی بتاؤ،

کبھی کوئی اپنی متاعِ عزیز کا بھی مذاق اڑاتا ہے؟“

”تم۔۔۔۔۔“ وہ اسی قدر کہہ سکی۔

”ہاں جوا! ہمراہی کی خواہش صرف تمہارے اندر ہی نہیں مچلی، میں خود اس خواہش کا

اسیر رہا ہوں۔ اور پتہ ہے! تمہیں تنگ کرنے، چھیڑنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ کسی طرح تم اپنے دل

کی بات کہو اور اگر کہو نہ تو تمہارے کسی انداز سے تو ظاہر ہو لیکن تم بہت گہری ہو جوا! برس ہا برس

خاموش رہیں۔“

”خاموش تو تم بھی رہے۔“ وہ بے اختیار اور شاید بے خیالی میں کہہ گئی اور وہ ہنس پڑا۔

”صرف زبان سے نہیں کہا، ورنہ میرا ہر انداز خاص کر آنکھیں محبت کا پیغام دیتی

رہیں۔ لیکن تم شاید آنکھوں کی زبان نہیں سمجھتیں۔“

وہ کچھ دیر تک دیکھتی رہی، پھر اُس کی طرف سے رخ موڑتے ہوئے بولی۔

”تمہیں تو غالباً سعدیہ اور نادیہ جیسی لڑکیاں پسند ہیں۔ اور میں اُن جیسی نہیں ہو سکتی۔“

”تمہیں کس نے کہا کہ تم اُن جیسی ہو جاؤ۔“

”تم ہی نے تو کہا تھا۔“

نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

رات میں جب وہ فراغت سے جیٹھی تو تینوں بہن بھائی اُس کے پاس آ بیٹھے۔ سب سے بڑا عمران، میٹرک میں تھا۔ اُس سے چھوٹا زمان آنھویں میں اور ان دونوں سے چھوٹی فرح جھٹی کلاس میں تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ تینوں بچے خاصے ذہین اور سلجھے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں اچھے سکولوں کی تعلیم نے اُن کی شخصیت کو نکھار کر اعتماد بخشا تھا یا اُن کی ماں کی تربیت اچھی تھی۔ وہ دل ہی دل میں سراہے بغیر نہ رہ سکی۔

ساتھ ہی ایک بات جو اسے کھٹکی، وہ ان کا لہجہ تھا۔ یعنی اپنی حیثیت سے بڑھ کھاپنے آپ کو پوپز کرنا۔ راستے میں ہی ابو جی نے اُسے اپنے بزنس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک دو پلاٹ خرید کر اُس پر مکان تعمیر کرتے ہیں، پھر منافع پر بیچ دیتے ہیں۔ یعنی کنسٹرکشن کے ابتدائی مراحل میں تھے، جبکہ بچوں کا انداز یہ بتاتا تھا جیسے اُن کا باپ کسی بہت بڑے پلازا کا مالک ہو۔ پھر اگلے چند دنوں میں اُس نے اس دوسری عورت جنہیں وہ آنٹی کہنے لگی تھی، اُن کی باتوں سے بھی محسوس کیا جیسے ابو جی کسی بہت بڑے پروجیکٹ پر کام کر رہے ہوں۔ یا ایسا کوئی پروجیکٹ انہیں ملنے والا ہو۔

بہر حال اُس کے لیے یہ تشویش کی نہیں بلکہ خوشی کی بات تھی اور پھر اُسے کیا فرق پڑتا تھا کہ آنٹی اس گھر سے نکل کر ہزار گز کے بنگلے میں رہنے کی باتیں کرتی تھیں۔ اُس نے کون سا زیادہ عرصہ یہاں رہنا تھا۔ وہ تو انتظار میں تھی کہ کسی دن نانی اماں اور ماموں جان وغیرہ آئیں گے اور اُسے ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اور ابھی وہ انتظار کی گھڑیاں گن رہی تھی کہ ابو جی نے نیا گھر خریدنے کی اطلاع دی۔ آنٹی اور بچے بے حد خوش تھے اور نئے گھر میں شفٹ ہونے کے لیے خاصے پُر جوش۔ آنٹی نے اسے اپنی پسند اور مرضی کے مطابق ڈیکوریٹ کیا۔

کافی دن بعد جب اس نئے گھر میں اطمینان سے بیٹھنا ہوا تو وہ آنٹی سے کہنے لگی۔

”آنٹی! میں خط لکھ کر ماموں جان کو اس نئے گھر کا ایڈریس بھیج دوں تاکہ وہ آئیں تو

انہیں دشواری نہ ہو۔“ جواب میں آنٹی نے خاصی سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔

”بھجج دو لیکن میرا خیال ہے، اب وہاں سے شاید ہی کوئی آئے۔“

”نہیں آنٹی، وہ ضرور آئیں گے۔ ممانی جان اور سرد نے خاص طور سے کہا تھا۔“

”اچھا!“ آنٹی استہزائیہ انداز میں ہنسیں، پھر اُس کی ٹھوڑی چھو کر گلے لگیں۔

”یونہی تمہارا دل رکھنے کی خاطر کہا ہوگا۔ ورنہ جب سب رشتے ہی توڑ دیے جائیں تو

پھر یہاں کیا کرنے آئیں گے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

”کیا واقعی تمہیں نہیں معلوم!“ آنٹی اُسے متحس کرنے کی خاطر ایسے لہجے میں

بولیں۔ ”میرا تو خیال تھا تمہیں معلوم ہوگا، تمہارے ابو جی نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔“

”ک۔ کیا؟“ وہ الجھنے لگی۔

”یہی کہ تمہیں یہاں لاتے وقت تمہارے ابو جی نے تمہاری نانی اماں اور ماموں وغیرہ

سے تمہارے سلسلے میں بات کی تھی کہ اگر اُن کا ارادہ تمہیں ہمیشہ وہیں رکھنے کا ہو، میرا مطلب ہے

سرد کے ساتھ شادی کا تو تمہیں وہیں چھوڑ دیا جائے یا پھر کچھ دنوں بعد وہ آکر یہاں سے شادی کر

کے لے جائیں لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ آنٹی لمحہ بھر کو خاموش ہوئی تھیں کہ اُس نے فوراً پوچھا۔

”انہوں نے منع کر دیا۔ صاف کہا کہ اُن کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور تمہاری ممانی

نے تو یہاں تک کہا کہ وہ اپنی بہن کی لڑکی لانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔“

”کون؟“ نادیدہ!

”پتہ نہیں۔ نام وغیرہ تو میں نہیں جانتی۔ بہر حال تمہارے ابو جی بہت دلبرداشتہ ہوئے

تھے۔“

اور دل تو اُس کا بھی ٹوٹا تھا یوں کہ پھر آنٹی کی مزید کوئی بات سنی ہی نہ گئی۔ کوئی دیوار

گری تھی شاید کہ یہاں وہاں ہر طرف شور ہی شور تھا۔ پُپ چاپ آنٹی کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتی رہی، پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھیں وہ۔ اور پھر اُسی طرح خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ سامنے آئینے میں اپنے آپ پر نظر پڑی تو لگا جیسے وہ کہیں اُس پاس کھڑا شوخی سے گنگنا رہا ہو۔

۔ نالے لگی تے نالے کالی

”سرمد!“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔

”تم نے ہمیشہ میرا مذاق اڑایا ہے اور آخری وقت میں بھی نہیں چھوڑا۔ ایسا بھیا نک مذاق!“ وہ ہیڈ پر گری تو ٹیکے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

کسی سے نہ کوئی گلہ نہ کوئی شکایت۔ بس اپنے آپ سے لڑتی رہی، کبھی سرمد کا اُن آخری لمحوں میں محبتوں سے چُور لہجہ یاد آتا تو لگتا وہی سچ ہے اور آنٹی اس سچ کو جھٹلاتی ہوئی سامنے آ جاتیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کا یقین کرے۔ کئی بار سوچا کہ خط لکھ کر سرمد سے معلوم کرے لیکن پھر خیال آتا کہ اُس نے تو بہت جلد آنے کو کہا تھا۔ اور اگر وہ سنجیدہ ہوتا تو دیر کیوں کرتا۔

”ہو سکتا ہے، کوئی اُس پرانے گھر میں آیا ہو؟“

اس خیال کے ساتھ ہی اُس نے سرمد کو تو نہیں نانی اماں کو خط لکھا۔ محض اپنے نئے گھر کا ایڈریس بتانے کے لیے۔ پھر اُس کے بعد وہ بہت دن تک انتظار کرتی رہی۔ اس دوران آنٹی مسلسل اُس کا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ اُس کی بے چینی، بے قراری، ہر آہٹ پر چونک چونا اور اندر ہی اندر اپنے آپ سے لڑنے اور الجھنے کی کیفیت..... کچھ بھی تو ان کی تیز نظروں سے چھپا نہیں تھا۔

ان دنوں یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے اندر حوصلہ پیدا کر رہی ہے۔ اور کسی بھی دن آنٹی سے

کہے گی۔ میں نانی اماں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ آخر اُن سے پوچھوں تو سہی کہ ایک عمر سینے سے لگائے رکھنے کے بعد اچانک دودھ کی مکھی کی طرح نکال کیوں پھینکا اور ممانی جان نے تو ہمیشہ ہی کسی نہ کسی موقع پر جتایا کہ وہ اُسے اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔ پھر اچانک اُن کا ارادہ کیسے بدل گیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے اندر حوصلہ پیدا کر لیتی، آنٹی اُس کے سامنے اس قسم کی باتیں کرنے لگتیں۔

”جب سے تمہارے ابو جی تمہارے ننھیال سے ہو کر آئے ہیں، تمہاری طرف سے مامے فکر مند ہیں، ورنہ اب تک تو اُنہیں یہی اطمینان تھا کہ تمہارے ماموں جی تمہیں اپنی بہو بنا لیں گے۔“

پھر اپنی رائے دیتیں۔

”مجھے حیرت ہے کہ تمہیں پالنے کے باوجود وہ تمہارے لیے اس انداز سے نہ سوچ سکے۔ کس بات کی کمی ہے تم میں۔ ماشاء اللہ اچھی خاصی شکل و صورت ہے، بس ذرا رنگ دیتا ہوا ہے، اور رنگ کا کیا ہے۔ ادھر خوشی اور خوشحالی ملے، نکھر جاتا ہے۔ ابھی بھی اپنے آپ کو دیکھ لو، جب سے یہاں آئی ہو، پہلے سے کتنی نکھری نکھری سی ہو۔“

(گویا جتا دیا کہ تم وہاں خوش نہ تھیں۔ اور نہ ہی خوشحالی نصیب تھی)

پھر ایک اور خیال۔

”میرا خیال ہے اُنہوں نے یہ سوچا ہوگا کہ تمہیں جہیز نہیں ملے گا اور نہ کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا ہے۔“

پھر آہ بھر کر بولیں۔

”بے وقوف ہیں وہ لوگ جو ایسا سمجھ بیٹھے۔ یہ ضرور ہے کہ تمہارے ابو جی مصروفیت کی وجہ سے تمہارے پاس آنے سکے۔ لیکن وہ کبھی تم سے بے خبر نہیں رہے۔ وہ تو تمہارے لیے اُس وقت سے چیزیں اکٹھی کر رہے ہیں جب ہمارے حالات اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔

اب تو خیر اللہ کا شکر ہے۔ ہم وہ کچھ دیں گے تمہیں جس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔“
اور کوئی سوال اس کی زبان پر آنے سے پہلے ہی کہتیں۔

”تم فکر مت کرو جو! دیکھنا ہم کس شان سے بیاہیں گے تمہیں۔ اور میں تو تمہارے ابو جی سے بھی یہی کہتی ہوں کہ فکر کس بات کی، اپنی جو کے لیے رشتوں کی کمی تھوڑی ہے۔“

اور وہ جو اپنے اندر تھوڑا بہت حوصلہ پیدا کر پائی تھی وہ آنٹی کی باتوں نے توڑ دیا۔ نئے سرے سے سوچا تو آنٹی کی باتیں ہی سچ لگیں۔ اور برس برس سے جو خواہش دل کے اندر پروان چڑھتی رہی تھی، وہ سک بن گئی۔ وہ ساری ہستیاں جنہوں نے اُس وقت اُسے سینے سے لگایا تھا جب اپنے سگے باپ کی نظروں میں اُس کا وجود کھٹکنے لگا تھا۔ اور اُن کی محبتیں اور بے غرض چاہتیں، جن کی جڑیں اُس کے اندر تک پھیلی تھیں انہیں ایک دوسری عورت نے بہت خوبصورتی سے کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے مقصد میں اس حد تک کامیاب ہوئی کہ جب وہ یعنی جلیلہ رب نواز بیواہ کر جنید خان کے سنگ جا رہی تھی تو اُس کی سوچوں کا انداز یکسر بدل چکا تھا۔ جنید خان کے عالیشان بنگلے کے عالیشان بیڈروم میں بیٹھی مانوس دھڑکنوں اور غیر مانوس آہٹوں کے ملے جلے شور میں گھری سوچ رہی تھی۔

”کس قدر دو غلے ہیں ممانی جان اور سرمد، اور لالچی بھی۔ مجھے شاید لاوارث سمجھ لیا تھا۔ اب آکر دیکھیں تو ذرا! ابو جی نے کس شان سے مجھے رخصت کیا ہے۔ اور ایسا عالیشان گھر تو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔“

اُس نے اپنی کلائیوں میں پڑی درجن بھر سونے کی چوڑیوں کو دیکھا۔ پھر ذرا ساسر اونچا کر کے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ ہر شے نہایت قیمتی اور خوبصورت تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خود اُس نے بھی کبھی ایسا تصور نہیں کیا تھا۔ لمحہ بھر کو یوں لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو، لیکن پھر خود ہی ہنس پڑی۔

”اتنا اعلیٰ ذوق رکھنے والا پتہ نہیں خود کیسا ہوگا!“ اُس نے سوچتے ہوئے گھٹنوں پر

تھوڑی ٹکائی ہی تھی کہ دروازہ کھٹکنے کی آواز پر فوراً سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”سوری ہنی! میں ذرا لیٹ ہو گیا۔“ آنے والا تیز قدموں سے اندر داخل ہوا تھا۔ اور آتے ہی یوں بولا جیسے اُسے کسی میننگ میں پہنچنے میں دیر ہو گئی ہو۔
”کم آن ڈیر! تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو۔ جاؤ چینیج کر کے آؤ۔“

اُس کے لہجے میں بے زاری محسوس کر کے اُس نے سر اٹھایا تو جیسے ساکت ہو گئی۔ سامنے کھڑا بچپن ساٹھ سالہ جنید خان کوٹ اتارنے کے بعد ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر رہا تھا۔ یہ صحیح ہے اُس کی صحت قابل رشک تھی اور پیسے کی فراوانی نے چہرے پر گزرتے ماہ و سال کی لکیریں بھی نہیں کھینچی تھیں۔ لیکن جذبات کی وہ لہریں نہیں تھیں جو اُن چھوٹی کلی کو دیکھ کر سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ایسا دریا جو سارے طوفانوں سے گزر کر اب اس مقام پر ٹھہر گیا تھا، پرسکون ہو گیا تھا۔ یا پھر بوڑھا اور کمزور کہ طوفانوں سے لڑنے کا حوصلہ تو تھا لیکن وہ جوش نہیں جو ایام جوانی میں اکساتا ہے۔

”لیزی گرل! اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟“ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہاما تو وہ چونکی۔ سر جھٹک کر بیڈ سے اُتری اور سیدھی ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ ذہن اچانک یوں ماؤف ہو گیا تھا کہ وہ کچھ سوچ ہی نہ سکی۔

صبح ڈانٹنگ روم میں موجود چند افراد کا تعارف جنید خان نے یوں کروایا۔

”یہ ہمارا سب سے بڑا بیٹا ہے طاہر خان۔ آجکل یہ اسلام آباد میں ہوتا ہے اپنے بیوی بچوں سمیت۔“

اُس نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر سامنے بیٹھے طاہر خان کو دیکھا اور اُس کی نظروں میں اپنے لیے ناگواری محسوس کر کے فوراً دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔

”طاہر کے بعد یہ فرجید ہے، ہماری اکلوتی بیٹی۔ یہ یہیں کراچی میں ہوتی ہے۔ اُس کامیاں بہت کامیاب بزنس مین ہے۔“

آکھڑ ہو رہی تھی، اس کا خیال کسی کو نہیں آیا کہ وہ ایک رات کی دہن، ان باتوں سے اپنے آپ میں چوری بن رہی تھی جیسے سارا قصور اُسی کا ہو۔

”سارہ کو نہیں جانتے آپ!“ طاہر خان کہنے لگا۔ ”اُسے تو ایک موضوع مل جائے گا بچوں کا خیال کیے بغیر میرا ریکارڈ لگائے گی۔“

”بس!“ جنید خان میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔ ”بند کرو اپنی اپنی بکواس۔ مجھے اس گھر کے لیے عورت کی ضرورت تھی، سو میں لے آیا۔“

پھر قدرے نرم پڑتے ہوئے کہنے لگے۔

”مجھے بنی کا خیال تھا۔ کس قدر تنہائی محسوس کرتا ہے وہ۔“

”آپ بنی کے لیے کسی گورنس کا انتظام بھی کر سکتے تھے۔“ فرحیہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”یہ سب کر کے دیکھ چکا ہوں۔ گورنس اس وقت ٹھیک نہیں ہے، جب میں یہاں ہوتا ہوں اور جن دنوں میں باہر رہتا ہوں، اُسے اپنی من مانی کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور تم جانتے ہو، سال میں چار پانچ مہینے تو میرے باہر ہی گزرتے ہیں۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں۔ بنی اسے قبول کر لے گا۔“ فرحیہ کا اُس کی طرف اشارہ اور لہجہ انتہائی ہنک آمیز تھا۔ اور مزید برداشت کی شاید اس میں طاقت نہیں تھی کہ بہت خاموشی سے کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جنید خان کو اگر اپنی اولادوں کا خیال نہ ہوتا تو یقیناً اُسے روکتے۔ ٹھیک سے ناشتہ کرنے کے لیے کہتے لیکن اس وقت وہ بس اسے جاتا ہوا دیکھ سکے۔

اپنے کمرے میں آ کر بیٹھی تو اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور پھر رات میں جنید خان نے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ کم از کم اُسے تو بتا دیتے کہ ان کی جوان اولادیں اس شادی پر رضا مند نہیں تھیں۔ وہ تو بس ابتدائی چٹکھوں میں انہیں دیکھ کر مایوس تھی۔ اور شاید انہوں نے اُس کی کیفیت محسوس کی تھی جیسی جب وہ

اُس نے دیکھا وہ تفر کے احساس میں گھری اس سے لاطعلق نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

”اور یہ آصف خان ہے۔ گزشتہ ماہ ایم بی اے کر کے لوٹا ہے۔ اور اب میرے بزنس کو مزید پھیلانے میں کوشاں۔“

ان دونوں کی نسبت وہ قدرے بہتر نظر آیا کہ اُسے دیکھ کر مسکرایا بھی اور ہلوا بھی کہا۔ ”سب سے چھوٹا بنی، اپنے کمرے میں ہے، تم ناشتہ کے بعد اُس سے مل لینا۔“ بات کے اختتام پر انہوں نے دونوں ہاتھوں کو ایک خاص انداز سے اٹھا کر تعارف مکمل ہونے کا اشارہ دیا۔ پھر اُن سب کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

”اور بچو! یہ تمہاری مہمی ہیں۔“

”ممی!“ فرحیہ ہنسی۔ ”فارگاہ سیک ڈیڑی! اتنی لڑکی کو آپ ہماری مہمی تو نہ کہیں۔ اور میں پوچھتی ہوں یہ بیٹھے بٹھائے آپ کو شادی کی کیا سوچھی۔ یہ کوئی عمر ہے؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا، میں بوڑھا ہو گیا ہوں کیا؟“

”بوڑھے تو نہیں ہوئے۔“ طاہر خان فرحیہ کا ساتھ دیتے ہوئے بولا۔ ”لیکن جوان بچوں کے باپ ہونے کے ساتھ ساتھ نانا اور دادا بھی ہیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”آپ کو فرق نہیں پڑتا لیکن ہمارے لیے خاصی مشکل کھڑی کر دی ہے آپ نے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”آپ کو سوچنا چاہیے تھا کہ آپ کے اس اقدام سے ہماری گھریلو زندگی کتنی ڈسٹرب ہوگی۔“

”اور کیا!“ فرحیہ بول پڑی۔ ”میرے سسرال میں جب سب کو معلوم ہو گا تو میری پوزیشن کتنی خراب ہوگی۔“ اپنی پوزیشن کا کتنا خیال تھا انہیں۔ اور جو اُس وقت اُس کی پوزیشن

رہی تھی۔

سنگ روم سے کچھ شور کی آواز آئی تو وہ چونکی۔ اور اٹھ کر کمرے سے نکل آئی جہاں سے شور کی آواز آرہی تھی اس طرف آ کر دیکھا تو ایک لڑکا وہیل چیئر پر بیٹھا ملازم پر برس رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اُس نے ملازم سے پوچھا۔

”بٹی صاحب ناشتہ نہیں کر رہے۔“

”کہاں ہے بٹی؟“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”یہ آپ کے سامنے موجود ہیں۔“ ملازم نے وہیل چیئر پر بیٹھے لڑکے کی طرف اشارہ کیا تو وہ حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ جس انداز سے گھروالے اس کا ذکر کر رہے تھے، اُس سے وہ یہی سمجھتی تھی کہ بٹی کوئی چھوٹا سا بچہ ہوگا۔ جبکہ اُس کے سامنے بیٹھا لڑکا اٹھارہ انیس سال سے کم کا نہیں تھا۔ اور اُسے یوں کھلی آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ پوچھنے لگا۔

”آپ کون ہیں؟“

”میں!“ وہ سنہل کر کھڑی ہو گئی۔ اور اپنا تعارف کروانے کی بجائے کہنے لگی۔ ”مجھے

چھوڑ دیں کوئی بھی ہوں۔ یہ بتاؤ تم ناشتہ کیوں نہیں کر رہے؟“

”میری مرضی!“ وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

”اچھی بات ہے۔“ پھر ملازم کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ”تم جاؤ بابا۔ جب بٹی کا دل

چاہے گا ناشتہ کرے گا۔“

”ارے!“ بٹی ہنسا۔ ”آپ نے تو بڑی جلدی میری بات سمجھ لی۔“

”اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات تھی؟“

”یہی تو میں بھی کہتا ہوں کہ آخر میری سیدھی سادی باتیں لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں

آتیں۔ اب دیکھیے میرا ناشتہ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ لیکن بابا بضد ہیں کہ میں ناشتہ کر لوں کیونکہ

ڈیڈی کا حکم ہے، اور ابھی کچھ دیر میں ڈیڈی فون کر کے بابا سے پوچھیں گے کہ میں نے ناشتہ کیا یا

باس تبدیل کر لے دوبارہ کمرے میں آئی تو وہ سرد مہری کا لبادہ اُتار چکے تھے۔ اور اُن کا یہ دوسرا روپ خاصا متاثر کن تھا کہ وہ فوراً ہی مایوسیوں سے نکل کر نئی زندگی سے سمجھوتا کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اور اب جو صورت حال سامنے آئی تھی، اس سے وہ بہت دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ گھروالوں، خاص کر آنٹی پر حیرت ہو رہی تھی کہ اُنہوں نے یہ تک نہیں بتایا تھا کہ جنید خان اُس کے باپ کی عمر سے بھی بڑے ہیں۔ وہ تو بس اُن کے اعلیٰ اسٹینس، عالیشان گھر اور دوسرے ممالک تک پھیلے ہوئے بزنس کی باتیں کرتی رہی تھیں۔

جنید خان بہت غلبت میں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ شاید فوراً کہیں جانے کا ارادہ تھا لیکن اُسے یوں پُپ چاپ بیٹھے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے اُس کے پاس رُک گئے۔

”کم آن سچیلہ! تمہیں ان باتوں کو محسوس نہیں کرنا چاہیے اور پھر انہیں کون سنا رہا ہے۔ ابھی فریڈیا اپنے گھر چلی جائے گی اور طاہر غالباً شام کی فلائیٹ سے جائے گا۔“

”آپ مجھے اُس سے ملو دیجئے، جس کے لئے مجھے یہاں لائے ہیں۔“ اُن کی بات نظر انداز کر کے وہ ٹہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”بٹی!“ وہ زریب بڑبڑائے، پھر قدرے جھنجھلا کر کہنے لگے۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو، میں تمہیں اپنے لیے لایا ہوں۔ مجھے بیوی کی ضرورت

تھی اس لیے شادی کی ہے تم سے۔“

”اور بٹی؟“

”بچوں کے سامنے کیا کہتا۔ مصلحتاً بٹی کا سہارا لیا۔“ پھر جاتے جاتے کہنے لگے۔

”اور سنو، میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ گھر میں جو تھوڑا بہت

وقت گزاروں، آرام اور سکون سے رہوں۔ تم سمجھدار لڑکی ہو۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ گھر میں

کوئی جھگڑا، کشیدگی یا ٹینشن برداشت نہیں کروں گا۔“

اُس نے بہت خاموشی سے اُنہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر کتنی دیر تک یونہی بیٹھی

”اُن دونوں کا کہنا ہے کہ سسرال والے اُن کا مذاق اڑائیں گے اور پتہ ہے صبح ناشتے کی ٹیبل پر دونوں نے اُن کے سامنے انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ سچ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔“

پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”پلیز! آپ خیال مت کیجئے گا۔“

”وہ کیا کہتی، خاموش ہی رہی۔ اسی وقت بابا پھر ناشتے کے لیے پوچھنے آ گئے۔ تو آصف تعجب سے بولا۔

”کیا مطلب! تم نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا؟“

”دل نہیں چاہ رہا تھا۔“

”چلو اب کرلو، بلکہ انہیں بھی اپنے ساتھ شریک کرلو کیونکہ صبح یہ بغیر ناشتہ کیے اٹھ کر چلی گئی تھیں۔“

”پہلے ایک بات طے کر لیں۔“ بنٹی نے کہا تو آصف کے ساتھ وہ بھی سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”کہ ہم انہیں کیا کہہ کر مخاطب کریں؟“

”یہ واقعی سوچنے کی بات ہے۔“ آصف ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوکے! میں آفس جا رہا ہوں۔ تم ان کے ساتھ طے کر لینا تو پھر مجھے بھی بتا دینا۔“

”آپ بتائیں، اپنے آپ کو کیا کہلوانا پسند کریں گی؟“ آصف کے جانے کے بعد وہ اُس سے پوچھنے لگا۔

”جو بھی نام دو۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ میری عزت نفس مجروح نہ ہو۔“ اُس نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر ناشتے کے بعد اُس نے خود بنٹی کو اس کے کمرے میں پہنچایا اور آکر گھر کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ فون آنٹی نے ہی اٹھایا۔ اُن کی آواز سنتے ہی وہ کہنے لگی۔

”نہیں۔“ کچھ دیر رک کر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

”بائے داوے آپ ہیں کون؟“

”تم بتاؤ۔“ وہ اُس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”کہیں آپ میری گورنس بن کر تو نہیں آئیں؟“

”پتہ نہیں!“

”کیا مطلب! آپ کو اپنے بارے میں نہیں پتہ؟“ وہ ابھی کوئی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ آصف خان آ گیا۔ ان دونوں کو ایک جگہ دیکھ کر غالباً پہلے ٹھٹھکا تھا۔ پھر آتے ہوا بولا۔

”بنٹی! تمہارا تعارف ہو گیا ان سے؟“

”آپ جانتے ہیں انہیں؟“ بنٹی اناس سے پوچھنے لگا۔

”ہاں بھئی، یہ ڈیڈی کی مسز ہیں۔ اس لحاظ سے ہماری مئی!“

”ارے!“ بنٹی زور سے ہنسا۔ ”تو کیا ڈیڈی نے شادی کر لی۔ مجھے بتایا تک نہیں۔“

”کل رات ہی تو ہوا ہے یہ حادثہ۔“ پھر اُس کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا کر بولا۔ ”خوشگوار حادثہ۔“

”اچھی بات ہے۔“ بنٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ بہت محفوظ ہو رہا ہو۔ اُسے یک گونہ اطمینان ہوا، کیونکہ فرجیہ نے کہا تھا، پتہ نہیں بنٹی اُسے قبول بھی کرتا ہے یا نہیں۔

”میرا بھی خیال ہے ڈیڈی نے اچھا کیا۔ لیکن طاہر بھائی اور فرجیہ۔“ آصف برا سامنہ بنا کر خاموش ہو گیا۔

”کیوں! اُن دونوں کو کیا تکلیف ہے؟“ بڑے بھائی اور بہن کے لیے بنٹی کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا۔

”آئی! آپ لوگوں میں سے کوئی آیا نہیں۔“

”ہاں وہ جنید خان نے منع کر دیا تھا۔“

”کیا مطلب؟؟ انہوں نے اپنے گھر آنے کو منع کیا ہے؟“

”نہیں نہیں۔“ آئی جلدی سے بولیں۔ ”میرا مطلب ہے یہ ریمیں وغیرہ پوری کرنے

کو منع کیا ہے۔ پھر میں نے سوچا، جب ایسے ہی جانا ہے تو کسی وقت اطمینان سے چلے جائیں گے، تم خوش ہو؟“

”جی! وہ یہی جواب دے سکتی تھی۔“

”اور ہاں سنو! صبح تمہارے ماموں جان کا ٹیلی فون آیا تھا۔“

”اچھا! کیا کہہ رہے تھے؟“

”تمہارا پوچھ رہے تھے کہ شادی ٹھیک ٹھاک ہو گئی۔ اور مبارکباد بھی دے رہے تھے۔“

”اس کی بھی کیا ضرورت تھی۔“ اُس نے آہستہ سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ اگر خوش نہیں تھی تو ناخوش بھی نہیں تھی۔ وہ ایک

شخص سرمد علی جس کی ہمراہی کی خواہش برس برس تک دل میں مچلتی رہی تھی۔ وہ اگر مقدر میں نہیں

تھا تو پھر کوئی بھی ہو، اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ زندگی تو بہر حال گزاری ہی تھی۔

اور وہ ہمیشہ ابو جی کے گھر نہیں بیٹھی رہ سکتی تھی۔ کسی وقت وہ اپنے حال کا موازنہ ماضی سے کرتی تو

اسے حیرت ہوتی کہ اتنی جلدی کتنی بدل گئی ہے۔ پہلے وہ کیا تھی، کنویں کی مینڈک۔ گھر کے کاموں

اور سلائی کڑھائی کے علاوہ کچھ نہ آتا تھا۔ اور وہ نہ جانتی تھی گھر کی چار دیواری سے باہر کی دنیا کیسی

ہے اور وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی حالانکہ اس نے انٹر تک پڑھا تھا۔ اس دوران وہ گھر

کی محدود زندگی سے ہٹ کر بھی کچھ دیکھ اور سوچ سکتی تھی لیکن سرمد نے اسکول اور کالج لانے لے

جانے ذمہ داری اتنی پابندی سے نبھائی تھی، بلکہ ایک طرح سے اس پر مسلط ہی رہا تھا کہ وہ اس سے

ہٹ کر نہ کچھ دیکھ سکی، نہ سوچ سکتی تھی۔ پھر ابو جی کے گھر وہ بس تین تین مہینوں

میں پہلے کچھ وقت انتظار میں کٹا، باقی ملا ل میں۔ اور اب اتنا ہی عرصہ اسے یہاں آئے ہوئے بھی ہو گیا تھا۔ گو کہ اب بھی اس کا بیرونی دنیا سے اتنا واسطہ نہیں تھا۔

لیکن اس بڑے سے گھر کے اندر وہ کبھی وہ بہت کچھ جاننے اور سمجھنے لگی تھی۔ نہ صرف

گھر سے باہر بلکہ شہر سے اور پھر ملک سے باہر کی باتیں بھی۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، کس طرح بڑی

مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگھنے کے لیے ہر وقت جبرؤں تک منہ کھولے رکھتی ہیں۔ اور یہی نہیں جب

جس پر بس چلتا ہے، نگل بھی لیتی ہیں۔ پھر مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم اور بڑی

طاقتوں کا خاموش تماشا کی بنے رہنا۔ وہ بنٹی کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی پر کشمیر، بوسنیا، افغانستان اور

بھارت کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور نا انصافیوں کو دیکھتی تو اس کا دل خون کے

آنسو روتا۔ اور جب بنٹی ان خبروں پر تبصرہ کرنے کے ساتھ مزید حالات و واقعات پر روشنی ڈالتا تو

وہ اندر تک لرز جایا کرتی تھی۔ پھر خاص طور سے اپنے ملکی حالات، سیاسی، اقتصادی، معاشی جیسے

اسے ازبر ہو گئے تھے۔ اور وہ خود بھی ان پر تبصرہ کرنے لگی تھی۔ اسے اپنے آپ پر حیرت بھی ہوتی

کہ آخر وہ اتنی بے خبر کیوں رہی۔

اُس روز ناشتے کی ٹیبل پر جنید خان نے سرسری انداز میں بتایا کہ وہ گیارہ بجے کی

فلائیٹ سے کراچی جا رہے ہیں۔ اور سنا تو اُس نے بھی بے خیالی میں تھا۔ لیکن پھر اچانک اس شہر

میں گزرے ماہ و سال اُس کے دل و ذہن میں دستک دینے لگے تھے۔ اور وہ ساری ہستیاں جنہوں

نے ایک عمر محبت سے سینے سے لگائے رکھے کے بعد آخر میں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا،

وہ سب یاد آنے لگیں۔ گو کہ اب وہ ان سب کو شدت سے یاد نہیں کرتی تھی۔ اور نہ ہی اُن کے لیے

مثبت انداز سے سوچتی، پھر بھی اُس آنگن میں گزرے ماہ و سال ایسے نہیں تھے، جنہیں ہمیشہ کے

لیے بھلا دیا جاتا۔ بچپن، بڑپن، جوانی، یہ سارے موسم اُس پر اس آنگن میں تو اترے تھے۔ اور پھر

نانی اماں جن کی آغوش میں اُسے ماما کی نرمی گرمی ملی تھی اُن کی یاد اتنی شدت سے آئی۔ وہ فوراً اُن کے پاس جانے کو بے چین ہو گئی۔ ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تو اُن سے کہنے لگی۔

”پھر تو مجھے کہنے دیجئے کہ آپ کی خوشی عارضی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”بھئی نہ تو ذیڈی کا ساتھ آپ کو خوشی دے سکتا ہے اور نہ وہ ہنگاموں بھرا شہر۔ آپ

بہت بور ہوں گی۔ ویسے بھی ذیڈی وہاں بہت مصروف رہیں گے۔“

”میں جانتی ہوں۔“

”پھر کیوں جارہی ہیں؟“

”اصل میں میرے کچھ عزیز ہیں۔ میں اُن سے ملنے جارہی ہوں۔“

”فرسٹ ٹائم جارہی ہیں؟“

”نہیں بھئی۔ میں تو شروع سے وہیں رہی ہوں۔ یہاں تو میں کچھ عرصہ قبل ابو جی کے

ساتھ آئی تھی۔“

پھر تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں بہت چھوٹی سی تھی، جب میری امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر ابو جی نے دوسری

شادی کی تو میری نانی اماں مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ انہوں نے ہی میری پرورش کی۔ میری

شادی پر وہ انہیں سکی تھیں۔ اور میں اب اُن سے ملنے جارہی ہوں۔“

”یہ بات ہے تو پھر واپسی کب ہوگی؟“

”تمہارے ذیڈی کے ساتھ ہی۔“

”اور اگر ذیڈی کل ہی واپس آ گئے تب؟“

”تب پھر یہ اُن پر منحصر ہے کہ مجھے کچھ دنوں کے لیے وہیں چھوڑ دیں یا ساتھ لیتے

آئیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”میں آپ کو روک تو نہیں سکتا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ زیادہ دن وہاں مت رہیے گا،

میں بہت اکیلا ہو جاؤں گا۔“

”خان صاحب! میں بھی آپ کے ساتھ کراچی چلوں گی۔“

اس تمام عرصے میں اس نے پہلی بار اُن کے ساتھ کہیں جانے کی بات کی تھی۔ اس لیے وہ قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”تم بہت بور ہوگی ڈیر! کیونکہ میں تو وہاں بہت مصروف رہوں گا اور پھر میرا کام ایسا ہے کہ۔۔۔“

”میں آپ کے کام میں مغل نہیں ہوں گی خان صاحب!“ وہ جلدی سے بولی۔

”وہاں میری نانی اماں ہیں، ان کے پاس چلی جاؤں گی اور جب تک آپ وہاں رہیں

گے میں نانی اماں کے پاس رہوں گی۔“

”اچھا!“ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگے۔ ”ٹھیک ہے تم تیاری رکھو، میں جاتے ہوئے

تمہیں لیتا جاؤں گا۔“

”تھینک یو۔“ وہ خوش ہو گئی، اور اُن کے جاتے ہی اُن کے بریف کیس کے ساتھ اپنا

بیگ بھی تیار کر لیا۔ پھر وقت گزاری کے لیے بنی کے پاس آ بیٹھی۔

”کیا بات ہے کسی کا انتظار ہے کیا؟“ باتوں کے دوران اُسے بار بار گھڑی دیکھتے دیکھ

کر بنی پوچھنے لگا۔

”ہاں۔ وہ تمہارے ذیڈی آئیں گے۔“

”اس وقت!“

”اصل میں، میں ان کے ساتھ کراچی جارہی ہوں۔“

”اچھا! تو اس لیے اتنی خوش نظر آرہی ہیں۔ بائے! داوے آپ کو کراچی جانے کی خوشی

ہے یا ذیڈی کے ساتھ جانے کی۔“ اُس نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ اُسے گھورتے ہوئے

بولی۔

”دونوں باتیں ہیں۔“

وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر ناخنوں سے کیونکس کھرچتے ہوئے بولی۔

”ایک بات پوچھوں بنی، بڑا تو نہیں مانو گے؟“

”نہیں، آپ پوچھیں۔“

”تمہارے ساتھ یہ حادثہ کب اور کیسے ہوا؟“ وہ اُس کی ٹانگ کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے بولی۔ پھر بہت خاموش نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہ سوال تو آپ کو پہلے روز ہی پوچھنا چاہیے تھا۔ اتنی دیر بعد کیسے خیال آیا؟“ وہ

افسردہ نظر آنے لگا تھا۔

”پہلے میں نے اس لیے نہیں پوچھا کہ کہیں تمہاری دل آزادی نہ ہو۔“

”اچھا!“ وہ دکھ سے ہنسا۔ ”میں تو سمجھا تھا، اب تک آپ نے غور ہی نہیں کیا۔ دیکھا ہی

نہیں کہ میں وہیل چیئر پر بیٹھتا ہوں کیونکہ اور لوگ تو سب سے پہلا سوال ہی یہی کرتے ہیں۔“

اُس کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔

”پہلے حیرت کا اظہار پھر افسوس، تاسف اور آخر میں ہمدردی، مجھے بے تحاشا غصہ آتا

ہے۔ دل چاہتا ہے، ان سے پوچھوں، ابھی راستے میں آتے ہوئے کتنے معذور لوگوں کو دیکھا۔ اور

کیا ہر ایک کے پاس رُک کر انہوں نے اسی طرح افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ اگر نہیں تو پھر مجھ

سے کیوں؟ میں اپنے آپ کو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں سمجھتا۔ آرام سے سارا دن بیٹھا رہتا

ہوں۔ خدمت کے لیے ملازم موجود ہیں، جو ایک آواز میں دوڑے آتے ہیں۔ اور کیا چاہیے

مجھے۔ ہمدردی کرنی ہے تو ان سے کریں جو واقعی مستحق ہیں۔ لیکن نہیں! وہ سب ایسا کیوں کریں

گے۔ راستہ چلتے لوگوں سے ہمدردی کے دو بول بول کر انہیں کیا ملے گا بھلا؟“

وہ بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ اُسے افسوس ہونے لگا کہ اس وقت کیوں یہ سوال کر بیٹھی۔

”آئی ایم سوری، مجھے شاید اب بھی نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔“

”سوری، مجھے آپ کو یہ سب نہیں کہنا چاہیے۔“

وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”آپ بھی کیا سوچتی ہوں گی کہ میں.....“

”نہیں میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا۔“

وہ اُس کی بات کاٹ کر بولی۔

”مجھے تمہاری باتوں سے اتفاق ہے، میں جانتی ہوں لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ

.....“

اُس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ جنید خان بڑی عجلت میں اندر آئے تھے، اور آتے ہی

چلنے کے لئے کہا۔ وہ اُنھ کھڑی ہوئی۔

”او کے بنی! تم اپنی روٹین خراب مت کرنا، میں جلدی واپس آؤں گی۔“

پھر مسکرا کر اس کا ہاتھ تھپکا اور جنید خان کے ساتھ باہر نکل آئی۔

دو گھنٹے بعد وہ کراچی کے ایک فائینڈر ہٹل میں جنید خان کے ساتھ لُنج کر رہی تھی۔

جنید خان نے آتے ہی اپنی فرم کے مینجر کو فون کر دیا اور کسی بھی وقت ڈرائیور گاڑی لے کر آنے والا

تھا۔

”تمہاری نانی اماں کا گھر کہاں ہے؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”من آباد۔“

”من آباد!“ وہ پُرسوز انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”یہ تو بہت

مشکل ہو جائے گی۔“

”کیسی مشکل؟“

”اگر پہلے تمہیں من آباد چھوڑنے جاؤں تو دو گھنٹے لگ جائیں گے، جبکہ مجھے.....“ وہ

گھڑی کی طرف دیکھنے لگے۔

”میں ماموں جان کو فون کر دیتی ہوں، وہ آکر مجھے لے جائیں گے۔“

”اوہ! اچھا۔“ انہوں نے سرمہ کا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ پھر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”کمال ہے تم سمن آباد سے اتنی جلدی یہاں آ گئے، جبکہ میرا ڈرائیور.....“

”میں سمن آباد سے نہیں آ رہا۔“

”پھر؟“

”میرا آفس یہاں سے قریب ہی ہے۔ ابھی ابھی نے فون کیا کہ مجھے اسی وقت جیلہ دلانا ہے اور میں آفس سے یہاں چلا آیا۔“

”چلو اچھا ہے۔ تم پہلے آ گئے۔ ورنہ جیلہ کو یہاں اکیلا چھوڑ کر جاتا تو میرا دھیان ادھر رہتا۔“ پھر اس سے کہنے لگے۔

”ٹھیک ہے ڈیر! تم جاؤ!“

”آپ بھی چلیں۔“ سرمہ نے انہیں بھی اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

”سوری بوائے! مجھے اپنے کام سے جانا ہے۔“

”اگر کوئی پرابلم ہے تو چلیں ہم آپ کو چھوڑتے ہوئے چلے جائیں گے۔“

”نو پرابلم! میں نے آفس فون کر دیا ہے۔ ڈرائیور گاڑی لے کر آتا ہوگا۔“

وہ سہولت سے اس کی پیشکش رد کر گئے تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”چلیں پھر۔“ اس نے جنید خان کی طرف دیکھا اور ان کا اشارہ پا کر اپنا بیگ اٹھا کر

ماکے ساتھ چل پڑی۔

”کیسے ہو؟“ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تو پوچھنے لگی۔

”ویسا ہی جیسا کہ پہلے تھا۔“ پھر ایک نظر اس پر ڈال کر کہنے لگا۔ ”البتہ تم بہت بدلی

لی لگتے رہی ہو۔“

”اچھا! وہ خواہ مخواہ نہیں۔“ کس لحاظ سے؟“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے، ورنہ میرا بہت وقت برباد ہوگا۔“

انہوں نے فوراً اس کی تجویز مان لی تو وہ کھانے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماموں جان کے گھرفون کیا تو اتفاق سے وہ خود ہی مل گئے۔ اس کی آواز سن کر بہت خوش ہوئے۔ جب اس نے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے فوراً آنے کی ہامی بھر لی۔ وہ مطمئن سی ہو گئی۔ فون رکھ کر جنید خان کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بریف کیس کھولے اپنی فائلوں میں اُلجھے تھے۔

وہ بہت خاموشی سے اُن کے سامنے جا بیٹھی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے یونہی بے خیالی میں اس کی طرف دیکھا۔ پھر ایک دم پوچھنے لگے۔

”کیا رہا؟“

”ماموں جان آرہے ہیں۔“

”تم نے انہیں کمرے کا نمبر بتا دیا ناں!“

”جی!“

”ٹھیک ہے۔ وہ آئیں تو تم اُن کے ساتھ چلی جانا۔ اور ہاں مجھے اُن کا نمبر بتا دو، جس روز واپسی ہوگی میں تمہیں فون کروں گا۔“

”آپ وہاں آئیں گے نہیں؟“ وہ انہیں نمبر لکھوا کر پوچھنے لگی۔

”اگر فرصت ملی تو آ جاؤں گا، ورنہ تم میری طرف سے معذرت کر لینا۔“

پھر بریف کیس بند کر کے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں پتہ نہیں کیا بولے اور تکیہ کھینچ کر نیم دراز ہو گئے۔ وہ کچھ دیر تک یونہی اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر نیبل سے میگزین اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر دستک ٹی آواز سنائی دی۔ اس کا اور اُن کا بھی خیال تھا کہ ڈرائیور ہوگا۔ اس لیے کم ان کہہ کر اٹھ بیٹھے اور سرمہ کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ کھڑی وہ گئی۔ اس کے سلام کا جواب دے کر اُن سے کہنے لگی۔

”خان صاحب! یہ میرے کزن ہیں۔ ماموں جان کے بیٹے سرمہ!“

”تم پاگل ہو گئے ہو شاید۔“ وہ دبے دبے لہجے میں دانت پیس کر بولی تو وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ لیکن مسکراہٹ ہونٹوں پر چلتی رہ گئی تھی۔

”باؤلا ہوا ہے کیا؟ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ نانی اماں نے بھی ڈانٹا۔

”ہنسنے کی بات تو ہے بڑی اماں کہ آپ ایک بڑھے کھوسٹ کو دولہا کہہ رہی ہیں۔“

”کیا!!“ ممانی جان آگے بڑھ آئیں۔ ”کس کی بات کر رہے ہو؟“

”جو کے دولہا میاں کی۔“ وہ اطمینان سے بولا تو ممانی جان اس کی طرف تاسف بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔ وہاں نانی اماں نے بھی دانتوں میں انگلی دبالی تھی۔ اور اس صورت حال سے پریشان ہو کر وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔

”تم سے تو بہر حال ہزار درجے اچھے ہیں۔“

”ٹھیک کہتی ہو۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھ سے اچھے نہ ہوتے تو تم انہیں مجھ پر ترجیح کیوں دیتیں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گیا۔ وہ اس کی بات نہیں سن سکی تھی۔ جب ہی سر ہکا کر دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔

”کیا ضرورت تھی مجھے یہاں آنے کی۔ جانتی بھی تھی کہ وہ اتنا بدتمیز ہے، پھر بھی چلی

ئی۔“

ممانی جان اس کی خاموشی کو خفگی سمجھیں اور اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی غرض سے کہنے

لگیں۔

”بیٹا! تم تو سرمد کی عادتوں سے واقف ہی ہو۔ اس کی باتوں کا برا مت ماننا۔“ اس نے

سکرانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

”بتاؤ تو جو! کیا سچ مجھ تمہارے دولہا.....“ رات میں وہ سونے کی غرض سے نانی اماں

کے پاس لیٹی تو وہ بڑی رازداری سے اس سے پوچھنے لگیں۔

”ہر لحاظ سے اور یقیناً یہ تبدیلی ایک بڑے آدمی کی لائی ہوئی ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ وہ لا پرواہی سے کہہ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

گھر میں نانی اماں، ماموں جان اور ممانی جان بہت بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ جب سرمد کے ساتھ آئی تو سب سے پہلے ممانی جان نے بڑھ کر اُسے گلے لگایا۔ اُن کے انداز میں وہی پہلے جیسی محبت اور گرم جوشی تھی۔ جبکہ وہ کسی طرح بھی اپنے اندر گرم جوشی پیدا نہ کر سکی۔ ماموں جان سے بھی اسی طرح ملی۔ البتہ نانی اماں کی آغوش میں کسی چھوٹی سی بچی کی طرح سا گئی۔ اور کتنی دیر تک اُن سے الگ ہی نہ ہوئی۔

”بس بھی کرو۔“ آخر سرمد کو ٹوکنا پڑا۔ ”چھ مہینے کوئی اتنے زیادہ تو نہیں ہوتے۔“

”کم بھی نہیں ہوتے۔“ وہ آنکھوں میں اُترا پانی رومال میں جذب کرتے ہوئے

بولی۔

”چلو اب آرام سے بیٹھو۔“ سرمد نے کرسی کھینچ کر اس کے سامنے کر دی تو نانی اماں

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولیں۔

”کیا اکیلی آئی ہو؟ تمہارے دولہا ساتھ نہیں آئے؟“

”دولہا!“ سرمد بے ساختہ اور زور سے ہنسا۔

”کیا ہوا؟“ ممانی جان اُس کے ہنسنے پر قدرے تعجب سے پوچھنے لگیں تو وہ اُسی طرح

ہنستا ہوا اُسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”سنا تم نے۔ نانی اماں کیا کہہ رہی ہیں۔ تمہارے دولہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا دولہا۔“

وہ مسہری پر ڈھکے گیا۔ اور اس کے شاکی نظروں سے دیکھنے کے باوجود باز نہیں آیا۔

کہنے لگا۔

”میرے خدا! اگر خان صاحب کو یہ پتہ چل جائے کہ یہاں انہیں دولہا کہا جا رہا ہے

تو.....“

تمہارے ماموں اور ممانی نے۔“

”ممانی جان بے بی۔“ وہ نیر یقینی سے پوچھنے لگی۔

”اور کیا! تمہاری ممانی جان کی تو ہمیشہ سے خواہش تھی تمہیں بہو بنانے کی۔ اور اس روز جھولی پھیلا کر تمہیں مانگا لیکن تمہارے ابا کی ایک ہی ضد تھی۔ میں بات طے کر آیا ہوں۔ اپنی بات سے پھر نہیں سکتا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

”اب میں کیا کہوں تمہارے باپ کو۔ ساری عمر تو پوچھا نہیں، آخر میں حق جتنا کر لے گیا۔ احسان فراموش ہے، کم از کم پالنے کا اتنا حق تو ادا کرنا کہ تمہاری شادی میں ہم سے مشورہ ہی لے لیتا۔“

نانی اماں اور بھی پتہ نہیں کیا کچھ کہتے کہتے سو گئیں تھیں۔ اور اُس کے لیے سوچوں کا ایک نیا باب کھل گیا تھا۔ پہلے تو اسے ان ساری باتوں کا یقین ہی نہیں آیا۔ پھر اس نے سوچا آخر نانی اماں اس سے غلط بیانی کیوں کریں گی، پھر وہ ہر بات کو نئے سرے سے سوچنے لگی۔

ابو جی کا برسوں بعد آنا اور اسے ساتھ لے جانا اور پھر آنٹی کا آہستہ آہستہ اسے اس گھر سے متنفر کرنا اور اپنے آپ کو اس کا سب سے بڑا ہمدرد ثابت کرنا، ہر بات اس پر واضح ہوتی چلی گئی۔

وہ کیوں اتنی نادان تھی کہ ایک دوسری عورت کی باتوں پر یقین کر کے ان بستیوں پر شبہ کر بیٹھی جو کہ آج بھی اس سے اسی طرح محبت کرتی ہیں۔ ان کی محبتیں اتنی کمزور تو نہ تھیں، پھر وہ کیوں متنفر ہو گئی۔ وہ بہت دکھ کے ساتھ اپنے آپ کو ملامت کر رہی تھیں۔

صبح وہ بہت جلدی اٹھ گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر بچن میں آئی تو سرمد پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ دروازے میں رُک کر خاموشی سے اسے چائے بناتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اور اس کی موجودگی کا احساس کر کے وہ کہنے لگا۔

”حسب سے نمبر“ یہ ذی نی میں نے سنبھال لی ہے۔“ وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر کہہ

”نہیں تو نانی اماں۔“ وہ ان کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی۔ ”آپ بھی کس کی

باتوں میں آگئیں۔ اتنے اچھے ہیں جنید خان، بس ذرا سی عمر ہی زیادہ ہے۔“

”کیا پہلے شادی شدہ تھے؟“ نانی اماں باقاعدہ کریدنے لگیں۔

”ہاں! لیکن بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”اور بچے؟“

”چار ہیں، تین لڑکے، ایک لڑکی۔“

”اولی اللہ!“ نانی اماں نے ماتھا پیٹ ڈالا۔ ”کہاں قسمت پھوڑ دی تمہارے باوا نے

تمہاری۔ چار بچوں کے باپ سے بیاہ دیا اور بچے تو تمہاری جان کو آجاتے ہوں گے۔“

”نہیں نانی اماں! یہ سب نہیں ہے۔“ وہ الجھ کر بولی۔ ”بچے چھوٹے نہیں ہیں۔ سب

بڑے بڑے ہیں۔ بڑا بیٹا اور بیٹی شادی شدہ ہیں۔ اور وہ ہمارے ساتھ رہتے بھی نہیں۔ تیسرے

نمبر کا ابھی کچھ دنوں میں یہیں کراچی سیٹ ہو جائے گا۔ اور چوتھا بھی اٹھارہ انیس سال کا ہے۔“

اپنے طور پر اس نے نانی اماں کو مطمئن کرنا چاہا تھا جبکہ انہوں نے ماتھے کے بعد سینہ

پیٹ ڈالا۔

”مت ماری گئی تھی تمہارے باوا کی جو اپنے سے بڑی عمر کے بندے کے ساتھ بیاہ

دیا۔ میں کہتی ہوں اپنے سرمد میں کیا کمی تھی۔ گھر کا بچہ ساتھ پلا بڑھا لیکن تمہارے باوا مان کے نہ

دیے۔“

”کیا کیا مان کے نہ دیے؟“ وہ نانی اماں کی آخری بات پر چونکی اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے

پوچھنے لگی۔

”یہی تمہاری اور سرمد کی شادی کی بات۔“

”نکس نے کی تھی؟“

”ہم سب نے۔ جس روز تمہارے باوا تمہیں لینے آئے تھے، اُسی روز میں نے

”بھی بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہو سکتے۔ سمجھتے تم!“
 ”ارے!“ وہ خجالت منانے کو ہنسا۔ ”تم تو اچھا خاصا بولنے لگی ہو۔“
 ”نہ صرف بولنے لگی ہوں بلکہ سمجھنے بھی لگی ہوں۔“ وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ
 ساری باتیں جنہیں وہ رات سمجھ چکی تھی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو رہی۔

”کیا سمجھنے لگی ہو؟“

”کچھ نہیں۔ اب پلیز تم ہنو یہاں سے، مجھے ناشتہ بنانے دو۔“

وہ زبردستی اُسے باہر نکال کر چولہے کے پاس کھڑی ہو گئی، پھر جس وقت ممانی جان
 آئیں وہ ناشتہ تقریباً تیار کر چکی تھی۔

انہوں نے حیرت سے اُسے دیکھا، پھر یہی سمجھیں کہ سرد نے پہلے کی طرح اُسے کام
 پر لگا دیا ہوگا۔ اور بغیر تصدیق کیے سرد کو سخت ست کہنے لگیں۔

”انتہائی بدتمیز لڑکا ہے، ذرا خیال نہیں ہے۔ اس نے تمہیں اٹھا دیا ہوگا۔“

”نہیں تو ممانی جان، میں خود اُٹھی ہوں۔“ وہ اُن کے مزید کچھ کہنے سے پہلے بول

پڑی۔

”بیٹا! اگر اُٹھ ہی گئی تھیں تو یہاں کچن میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”ممانی جان!“ وہ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولی۔ ”میں مہمان نہیں ہوں۔“

”پھر بھی بیٹا!“

”بس آپ کچھ مت کہیں۔ اندر جا کر بیٹھیں، میں ناشتہ لے کر آرہی ہوں۔“ کل وہ

ممانی جان سے بہت سرد مہری سے ملی تھی اور اب جبکہ ساری باتیں اس پر واضح ہو گئی تھیں تو اُسے

اس مہربان عورت پر بہت پیارا آ رہا تھا۔ جس نے ایک عمر اُسے ماما کی آغوش بخشی تھی۔ دل چاہہ ہا

تھا، اس آغوش میں سمٹ کر اپنی ساری مجبوریاں کہہ سنائے۔ بتادے اُنہیں کہ وہ ایک دوسری

عورت کے فریب کا شکار ہو گئی ہے اور اُس وقت تو نہیں، ناشتے کے بعد جب ماموں جان اور سرد

رہا تھا۔

”ویسے بھی اس وقت صرف میں ہی چائے پیتا ہوں اور صرف ایک کپ کے لئے امی
 کو اٹھانا اچھا نہیں لگتا۔ اور پتہ ہے اب تو مجھے یہ سوچ کر بھی افسوس ہوتا ہے کہ اتنا عرصہ میں تم سے
 زبردستی اپنے کام کروا رہا تھا۔ تمہیں اُتو لگتا ہوگا۔“

چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ اس نے کپ تمام لیا۔ لیکن
 اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ تب وہ اس کی غیر معمولی خاموشی محسوس کر کے چونکا۔

”کیا بات ہے کچھ پریشان ہو؟“ اُس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”شاید رات ٹھیک سے سو نہیں سکیں، یہی بات ہے ناں۔ جگہ تبدیل ہو جائے تو ایسا ہی

ہوتا ہے۔“ وہ خود ہی قیاس کرتا ہوا بولا۔ وہ پھر بھی خاموش رہی تو شپٹا گیا۔

”چلو اندر چل کر بیٹھو۔ میں امی کو اٹھاتا ہوں۔“

”نہیں رہنے دو اور تم یہاں سے نکلو، میں ناشتہ بناؤں گی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”کیا تم ناشتہ بناؤ گی؟“

”ہاں کیوں؟“

”نہیں بھئی، دو دن کے لیے آئی ہو اور پھر مہمان بھی ہو۔“

وہ کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر بڑھ کر خالی کپ ریک پر رکھتے ہوئے

بولی۔

”کل تم نے کہا تھا، تم ویسے ہی ہو جیسے پہلے تھے۔ لیکن تم ویسے نہیں ہو۔ ہاں کوشش

ضرور کر رہے ہو کہ پہلے جیسے نظر آؤ۔“

”نہیں بھئی، میں.....“

”مت پوز کرو سرد!“

”بند کرو یہ دیکھی باتیں جیسی اجنبیوں کے درمیان ہوا کرتی ہیں۔ ہم اجنبی نہیں ہیں۔ ہم

”آئی نے مجھے بتایا تھا کہ جب ابو جی مجھے لینے آئے تھے تو انہوں نے آپ سب سے پوچھا تھا کہ اگر آپ کا خیال مجھے ہمیشہ کے لیے نہیں رکھنے کا ہو تو وہ مجھے نہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن آپ نے منع کر دیا تھا۔“

”کیا؟“ ممانی جان تقریباً چیخ پڑیں اور نانی اماں آئی کو برا بھلا کہنے لگیں۔
 ”نامراد عورت! سوتیلی جو ٹھہری، کیسے تمہارا بھلا سوچ سکتی تھی۔ اور کیا اُس کی اپنی کوئی جی نہیں ہے جو تمہیں یہاں سے بلا بھیجا۔“

”ہے، لیکن ابھی بہت چھوٹی ہے۔“
 ”تو اُس کے بڑے ہونے کا انتظار کر لیتی۔“

”چھوڑیں اماں!“ ممانی جان کہنے لگیں۔ ”آپ خواہ مخواہ اس عورت کو اُلام دے رہی ہیں۔ اگر اس کا اپنا باپ ٹھیک ہوتا تو کیا مجال تھی اُس کی۔“

”ٹھیک کہتی ہو تم۔“ نانی اماں قائل ہو کر بولیں، پھر اُس کا سر تھکتے ہوئے کہنے لگیں۔
 ”بیٹا اب میں تمہیں اس کے سوا کیا کہہ سکتی ہوں کہ صبر کرو، شاید نصیب میں ایسا ہی لکھا تھا۔“

”میں نے تو نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا نانی اماں! لیکن اب جب حقیقت معلوم ہوئی ہے تو دل درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ کیا دیا ہے ابو جی نے ساری زندگی مجھے۔ کبھی پوچھا تک نہیں

اور جب اپنی غرض پڑی تو میرا خیال آگیا۔“
 وہ اور شدت سے روتے ہوئے بولی۔

”انہوں نے میرا مان توڑ دیا ہے۔ میں ساری زندگی ان سے دور رہ کر بھی اُن کے لیے اچھے جذبات رکھتی تھی۔ ہمیشہ دعا گورہی کہ میرا باپ جہاں رہے، خوش رہے لیکن انہوں

نے.....“
 ”بیٹا! ممانی جان نے اُس کا سراپے کندھے سے لگا لیا۔ ”یہ واقعی دکھ کی بات ہے،

لیکن اب کیا کیا جاسکتا ہے۔“

آفس چلے گئے اور کچھ وقت فراغت کا ملا تو نانی اماں نے پھر وہی باتیں چھیڑ دیں۔
 ”تمہارے باپ نے اچھا نہیں کیا۔ کیا تھا جو تمہیں ہمارے پاس چھوڑ دیتا۔ اگر پہلے سے کہیں زبان دے کر نہ آتا تو ہم کبھی بھی تمہیں اس کے ساتھ جانے نہ دیتے۔“
 اور وہ رو پڑی، پہلے نانی اماں اور پھر ممانی جان کی گود میں سر رکھا تو ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

”ابو جی پہلے سے میری بات طے کر کے نہیں آئے تھے۔“
 وہ روتے ہوئے بتانے لگی۔

”وہ ایک پلان کے تحت مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے، انہیں بڑے لوگوں کی قطار میں کھڑا ہونے کے لیے سہارا چاہیے تھا۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے میرے ارمانوں کا گلا گھونٹنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ جنید خان خود اُن سے عمر میں بڑا اور شادی شدہ بچوں کا باپ ہے۔ انہیں صرف اس بڑے پروجیکٹ سے دلچسپی تھی جو شادی کے بعد جنید خان کی معرفت انہیں ملا۔“

”مجھے تو تمہارے باپ کے لچھن شروع سے ہی کبھی اچھے نہیں لگے۔“
 نانی اماں اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

”میں بھی کہوں، یہ اچانک کیسے محبت نے جوش مارا کہ آنا فانا لے کے چلتا بنا۔ ہم کیا جانتے تھے کہ اس محبت کے پیچھے بھی اس کی غرض چھپی ہے۔“

”بیٹا جب تم جان گئی تھیں تو ہمیں خبر کرتیں، ہم تمہیں لے آتے۔“ ممانی جان نے کہا تو اس کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں۔

”میں نہیں جانتی تھی ممانی جان۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی، یہ تو رات نانی اماں کی باتوں سے مجھ پر بہت ساری باتوں کا ادراک ہوا۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”چلو یوں رو رو کر چکان مت ہو، اٹھ کر منہ ہاتھ دھو، اٹھو میری بچی!“

نانی اماں نے چکارتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو نانی اماں اور ممانی جان سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر فوراً خاموش ہو گئیں۔ اور اب وہ نادان نہیں تھی۔ سمجھ گئی کہ دونوں ابو جی کی حرکت پر تبصرہ کر رہی ہوں گی اور ساتھ ہی ملامت بھی۔ وہ چپ چاپ ان کے درمیان بیٹھ گئی تو ممانی جان اس خیال سے کہ کہیں دوبارہ نہ یہ موضوع چھڑ جائے، اُس سے پوچھنے لگیں۔

”یہ بتاؤ، دوپہر کے کھانے میں کیا کھاؤ گی۔“

”کچھ بھی نہیں، میرا مطلب ہے جو بھی پک جائے گا بلکہ آپ مجھے بتائیں میں پکاؤں

گی۔“

”نہیں بیٹا! صبح بھی تم اتنی دیر تک کچن میں کھڑی رہی ہو۔ اب اپنی نانی اماں کے پاس آرام سے بیٹھو۔“

”ممانی جان! مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ میں تو آرام سے بیٹھی رہوں اور آپ کھانا پکانے میں لگی رہیں۔“

”تم نے بھی تو مجھے بہت آرام پہنچایا ہے۔“

ممانی جان محبت سے اُس کا گال ہتھو کر بولیں۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئیں اور جانے کو تھیں کہ اُس نے پکار لیا۔

”ممانی جان! میں اپنے حالات سے سمجھوتا کر چکی ہوں۔ آپ سے اور نانی اماں سے اتنی گزارش ہے کہ ان باتوں کا علم ماموں جان اور سرمد کو نہ ہونے پائے۔“ ممانی جان کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہیں، پھر پُرسوج انداز میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

شام میں جنید خان کافون آیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ وہ مزید دو دن یہاں رُکیں گے۔ اور اُس سے پوچھا کہ اسے اپنے ماموں جان کے گھر میں کوئی تکلیف تو نہیں۔ اُس نے اپنی طرف

”ہے۔“

سے اُنہیں پورا اطمینان دلایا اور جب فون رکھ کر پلٹی تو سرمد اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ اسے وہاں کھڑے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”کس کافون تھا؟“

”جنید خان کا۔“ وہ مختصر جواب دے کر جانا چاہتی تھی کہ وہ سامنے آ گیا۔

”اُس بڑھے کو تمہارے بغیر چین نہیں ہے۔“

”سرمد!“ اس نے نوکا۔ ”اب اگر تم نے خان صاحب کے لیے ایسے الفاظ استعمال

کیے تو میں ماموں جان سے تمہاری شکایت کر دوں گی۔“

”کیا کہو گی اُن سے؟“ وہ مسکراہٹ دبا کا بولا۔

”تمہارا سر!“ وہ چڑ کر بولی اور پلٹ کر دوسرے راستے سے جانا چاہتی تھی کہ وہ پھر

سامنے آ گیا۔

”خفا کیوں ہوتی ہو!“

”تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟“

”چلو معاف کر دو۔“ وہ باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”یہ بتاؤ کیا کہہ رہے تھے تمہارے

خان صاحب؟“

”کوئی خاص بات نہیں، بس کہہ رہے تھے ابھی دو دن یہیں رُکیں گے۔“

”تم تو ابھی رہو گی ناں۔“

”نہیں، میں ان کے ساتھ ہی واپس جاؤں گی۔“

”اتنی جلدی!“

اپنے لہجے کی بے اختیاری، بے قراری کو خود ہی محسوس کر کے فوراً سنبھلتا ہوا بولا۔

”میرا مطلب ہے، جب آہی گئی ہو تو کچھ دن رہو، اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت

”کیا کرو گی؟“ اس نے شاید بے خیالی میں پوچھ لیا۔

”ظاہر ہے شاپنگ۔“

”اچھا۔ ہاں!“ وہ اپنی بے خبری پر ہنسا۔ پھر فوراً اٹھتا ہوا بولا۔ ”مجھے لے جانے پر

مراض نہیں ہے لیکن اگر تمہارے خان صاحب نے کہیں راستے میں دیکھ لیا تو؟“

”تو کیا ہوا۔ وہ کیا کہیں گے بھلا۔“

”سوری، میں بھول گیا تھا۔ یہ خوف تو ہم ٹڈل نکلاں والوں کو ہوتا ہے۔“ اس کے شاکی

مردوں سے دیکھنے پر شانے اچکا کر بولا۔

”چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

”میں بس تیار ہی ہوں۔ تم البتہ چیئنج کر لو، میں جب تک نانی اماں اور ممانی جان سے

لہہ دوں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ نانی اماں اور ممانی جان سے کہہ کر اپنا پرس

ٹھایا اور واپس آئی تو وہ صرف شرٹ چیئنج کر کے بٹن بند کرتا ہوا آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر باہر کی طرف

بل پڑا تو وہ بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چلی آئی۔

☆☆☆

دو دن پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ تیسرے دن صبح ابھی وہ ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی

تھی کہ جنید خان کا فون آ گیا۔ انہوں نے پہلی بات واپسی کی کہی پھر شاید مرونا اس سے پوچھنے لگے

تھر۔

”تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اگر مزید یہاں رہنا چاہتو تو۔۔۔۔۔“

”نہیں خان صاحب! میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گی۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”گڈ!“ وہ جیسے خوش ہو گئے۔

”آپ یہاں آئیں گے، میرا مطلب ہے مجھے لینے۔“ وہ پوچھنے لگی۔

”کیا کروں گی یہاں رہ کر؟“

”وہاں کیا کرتی ہو؟“

”کچھ نہ بھی کروں، پھر بھی وہاں میری ضرورت ہے۔“ پھر جیسے اپنے آپ سے بولی۔

”میرے آنے سے بنی کتنا اکیلا ہو گیا ہوگا۔“

”یہ بنی کون ہے؟“ وہ پوری طرح اُس کی طرف متوجہ تھا، جب ہی اُس کی اپنے آپ

سے کی گئی بات سُن لی۔

”خان صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔“

”بہت چھوٹا، میرا مطلب ہے گود کا بچہ ہے؟“

”ارے نہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔ پھر اُس کے ساتھ برآمدے سے اتر کر آگن میں آتے

ہوئے اُسے بنی کے بارے میں بتانے لگی۔

”ایک بات کہوں، بُرا تو نہیں مانو گی۔“ وہ بنی کے بارے میں سُن کر کہنے لگا۔ وہ سوالیہ

نظروں سے دیکھنے لگی۔

”مجھے لگتا ہے خان صاحب نے صرف بنی کے لیے تم سے شادی کی ہے، ورنہ اس عمر

میں انہیں کیا ضرورت تھی بھلا۔“ اس کا اپنا بھی یہی خیال تھا، اس کے باوجود اس کی تردید کر دی۔

”نہیں خیر ایسی بات تو نہیں ہے، مجھے خود ہی بنی کا خیال رہتا ہے۔“ اس کے بغور

دیکھنے پر نظریں پُراتے ہوئے بولی۔

”اگر ایسی بات ہوتی تو خان صاحب مجھے اپنے ساتھ لے کر کیوں آتے، اس کے

پاس چھوڑ دیتے۔“

”یہ تو ہے۔“ صاف لگ رہا تھا وہ محض اس کی بات رکھنے کی خاطر ایسا کہہ رہا ہے، جب

ہی وہ موضوع بدل گئی۔

”سنو، اگر اس وقت تمہارا کہیں جانے کا پروگرام نہیں ہے تو مجھے طارق روڈ لے چلو۔“

”کچا کھانے کا ارادہ ہے کیا؟“ وہ اُس کے گھورنے پر شرارت سے بولا۔

”یکومت! اور سنو، آج جلدی آ جانا۔ مجھے چار بجے ہوٹل پہنچنا ہے۔“

”خیریت!“

”ہاں، ابھی خان صاحب کا فون آیا تھا۔ آج ہم واپس جا رہے ہیں۔“

”تو کیا جنید خان یہاں نہیں آئیں گے۔“

”نہیں۔ انہیں فرصت نہیں ہے۔“

”تو فون کر کے انہیں کہہ دو کہ مجھے بھی فرصت نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں ان کا ملازم ہوں

کہ ان کے کہنے پر تمہیں لانے اور لے جانے کی ذیولٹی انجام دیتا پھروں۔“

”سرمد!“ وہ اُس کے اچانک موڈ بدلنے پر حیران ہوئی۔

”تم اُن کی بیوی ہو، اُن کی ذمہ داری ہونہ کہ میری۔“

اس کے ساتھ ہی وہ پیر پختا ہوا کمرے اور پھر گھر سے ہی نکل گیا۔ وہ کچھ دیر تک اُس

کے پیچھے نظریں دوڑاتی رہی۔ پھر طویل سانس لے کر نانی اماں کے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے اور

اپنی ہتھیلیوں پر فنی محسوس کر کے نانی اماں اُس پر جھک گئیں۔

”بیٹا! اس کی باتوں کا بُرا مت منانا۔“

”مجھے بُرا نہیں لگانا نانی اماں! اور پھر وہ غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔“

آنسوؤں کی آمیزش اس کے لہجے میں بھی سٹ آئی تھی۔

”پھر رو کیوں رہی ہو؟“

”میں رو تو نہیں رہی۔“

اُس نے مسکرانے کی کامیاب کوشش کی اور آنکھوں پر سے نانی اماں کے ہاتھ ہٹا کر ان

کی طرف دیکھنے لگی۔ اس سے وہ نانی اماں کو چھوٹی سی معصوم بچی کی طرح لگی جو اپنی کسی بھی کوشش

میں کامیاب ہو کر فخریہ انداز میں داد طلب نظروں سے دیکھتی ہے، انہوں نے اس کی پیشانی چوم

”سوری ڈیر! میں بالکل فارغ نہیں ہوں۔ تم چار بجے تک اپنے کزن کے ساتھ ہوٹل

آ جانا۔“

”جی بہتر۔“ اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور فون رکھ کر نانی اماں کے پاس چلی آئی۔

انہیں اپنی واپسی کا بتایا تو وہ خفگی سے بولیں۔

”یہاں کیا آگ اٹھانے آئی تھیں۔“

”نہیں، آپ سے ملنے۔“ وہ اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

”صرف دودن کے لیے۔ میں تو ابھی تمہیں دل بھر کر دیکھ بھی نہیں پائی۔“

”میں پھر آؤں گی نانی اماں!“ وہ ان کے بوڑھے ہاتھ اپنے گالوں سے لگاتے ہوئے

کہنے لگی۔ ”ابھی تو میں کیونکہ بغیر پروگرام کے آئی تھی، اس لیے جلدی جا رہی ہوں۔ پھر آؤں گی تو

بہت سارے دن رہوں گی۔“

”پھر پتہ نہیں کب آؤ گی۔“

”جب آپ بلائیں گی، بلکہ ایسا کریں سرمد کی شادی کر ڈالیں، پھر تو میں ضرور آؤں

گی۔“

”میں بلاؤں گا تب ناں۔“ وہ جو اندر آ رہا تھا، اس کی آخری بات سن کر کہنے لگا۔

”کیا مطلب!“ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”کیا تم مجھے اپنی شادی میں نہیں

بلاؤ گے۔“

”ہرگز نہیں۔“

”کیوں؟“

”میری مرضی۔“

”بیٹا! تم کس سے اُجھٹے لگیں۔ جانتی تو ہو، یہ تمہیں تنگ کرتا ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ

سرمد کی شادی ہو اور تمہیں نہ بلایا جائے۔“ نانی اماں نے کہا تو وہ اُسے گھورنے لگی۔

لی۔

”اپنے ماموں جان سے کہنا، وہ تمہیں چھوڑ آئیں گے۔“

”میرا جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے نانی اماں! میں اکیلی بھی جاسکتی ہوں، خیر چھوڑیں۔ یہ

بتائیں ممانی جان نے سرمہ کے لیے کوئی لڑکی بھی دیکھی یا نہیں۔“

وہ خوبصورتی سے بات بدل گئی، ساتھ ہی موڈ بھی۔

”لڑکیاں تو کئی ایک نظر میں ہیں لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ وہ فوراً پوچھنے لگی۔

”سرمہ ابھی راضی نہیں ہے۔“

”کیوں! کیا کہتا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ بس ابھی نہیں، ابھی نہیں کی رٹ لگا دیتا ہے۔ پتہ نہیں کیا چاہتا ہے“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔ ”اتنا ارمان ہے اس کی شادی کا۔ کم از کم میرا ہی خیال کرے،

بوڑھی جان ہوں، زندگی کا کیا بھروسہ! آج ہوں کل نہیں۔“

”ارے نہیں نانی اماں! ابھی آپ کو بہت جینا ہے۔ سرمہ تو کیا اس کے بچوں کی

شادیاں بھی دیکھتی ہیں۔“

اور شاید بچوں کے ذکر پر ہی نانی اماں کو یاد آیا تو اس سے پوچھنے لگیں۔

”سنو! تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”یہی چار پانچ مہینے۔“

”پانچ مہینے!“ نانی اماں کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگیں۔

”یہ کوئی اتنا زیادہ عرصہ تو نہیں ہے، پھر بھی تم کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔“

”کیوں؟“ وہ بالکل نہیں سمجھی۔

”بچے کے لئے!“

”بچہ!“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی دل میں مستاکا بیٹھا بیٹھا احساس جاگنے

”ہاں جو! تم اس سلسلے میں لا پرواہی مت کرنا۔“ نانی اماں اسے سمجھانے لگیں۔

”ایسی صورت میں جبکہ جنید خان کے بچے موجود ہیں، تمہیں غافل نہیں ہونا چاہیے۔

رجنید خان کا کیا بھروسہ۔ ہو سکتا ہے اسے مزید بچے کی آرزو نہ ہو۔“

نانی اماں کی بات سمجھ کر اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر چلا گیا۔ اور نانی اماں کہہ رہی

”عورت کی تکمیل ماں بننے سے ہی ہوتی ہے۔ اللہ نہ کرے جو تم ادھوری رہو۔ اور پھر

سے لیے تو اور بھی ضروری ہے کیونکہ جنید خان بڑا آدمی ہے۔ اگر تمہاری اولاد نہ ہوئی تو ساری

اداس کی پہلی اولادیں لے جائیں گی اور تم.....“

”نانی اماں!“ اس نے ٹوک دیا۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ!“

”میں غلط نہیں کہہ رہی۔ تمہیں آنے والے حالات سے آگاہ کر رہی ہوں۔ تم ابھی

ہو۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

”دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ خدا نخواستہ کل کو جنید خان کو کچھ ہو جائے تو اس گھر میں

ری جگہ نہیں رہے گی اور تم کہہ رہی تھیں کہ اس کی اولادیں تم سے بھی بڑی ہیں تو ایسی صورت

وہ تمہیں کھڑے کھڑے نکال باہر کریں گے۔ ہاں اگر جائداد کا حصہ پیدا کر لو تو پھر کسی کی مجال

ما، جو تمہیں کچھ کہہ سکیں۔“

وہ کچھ خوفزدہ ہو گئی اور یقیناً اس وقت کا تصور کر کے اندر ہی اندر دلہنے لگی تھی۔

”اللہ نہ کرے جو جنید خان کو کچھ ہو۔“ وہ ہم کر بولی۔

”ہاں بیٹا! وہ تمہارا سہاگ ہے۔ اللہ اسے سلامت رکھے، پھر بھی۔“

”بس نانی اماں!“ اس میں مزید کچھ سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس لیے اٹھ کر اپنا بیگ

ممائی جان نے یقین سے کہا اور وہ واقعی دوپہر کے کھانے پر موجود تھا۔ اُس کا دل چاہا
 ن تو فرصت نہیں تھی پھر کیسے آگئے۔ لیکن وہ کچھ اتنا سنجیدہ اور لائق تعلق سا نظر آ رہا تھا کہ اُس
 ہی نہ پیدا ہوئی۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تو وہ بھی کچھ دیر آرام کی غرض
 اماں کے پاس لیٹ گئی۔ ممائی جان بھی وہیں آگئی تھیں۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں میں وقت
 نہ کا پتہ ہی نہ چلا۔ ٹھیک تین بجے آکر وہ کچھ روٹھے روٹھے لہجے میں بولا۔
 ”چلو! تمہیں چھوڑ آؤں۔“ وہ اب بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن ممائی جان کا خیال
 خاموشی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا بیگ لا کر سامنے رکھا۔ پھر ممائی جان اور نانی اماں سے مل
 لی ڈھیروں دعائیں لیے اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔

”یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارا یا جنید خان کا خیال کر کے آیا ہوں۔“ وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا
 ”مجھے ابو جی نے تاکید کی تھی اس لیے چلا آیا۔“
 ”شکریہ۔“ وہ مصالحت پر آمادہ تھی۔ اس لیے مسکرا کر شکریہ کہا تو وہ بھی زیادہ دیر اپنا
 اب نہ رکھ سکا۔

”پھر کب آؤ گی؟“

”تمہاری شادی پر۔“

”یقیناً امی نے تمہیں کہا ہو گا کہ مجھے شادی پر آمادہ کرنا۔“ اسے حیرت تو ہوئی لیکن ظاہر
 لیا۔ انجان بن کر پوچھنے لگی۔

”کیوں، کیا تم شادی کے لیے آمادہ نہیں ہو؟“

”شادی کروں گا لیکن ابھی نہیں۔“

”ابھی کیوں نہیں؟“

”بس میری مرضی۔ اور اب خدا کے لیے اس موضوع پر بات مت کرنا۔“

وہ اکتا کر بولا تو وہ کندھے اچکا کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

ٹھیک کرنے لگی۔

پھر کچھ وقت اس نے اپنے آپ کو بہت مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ کچن میں جا کر
 ممائی جان کے منع کرنے کے باوجود کھانا پکانے میں ان کے ساتھ لگی رہی۔ اصل میں نانی اماں کی
 باتوں نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اور وہ ان کے پاس سے اُٹھ تو آئی تھی لیکن ذہن مسلسل الجھا ہوا
 تھا۔ ممائی جان سے باتیں کرتے ہوئے بھی وہ ایک دم خاموش ہو جاتی۔ ابھی پتہ نہیں انہوں نے
 کیا کہا تھا۔ اس نے سنا ہی نہیں۔ بس چپ چاپ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تو پھر تم سرمد سے بات کر دو گی ناں۔“ ممائی جان نے کہا تو وہ چونک گئی۔

”کیا بات؟“

”شادی کی، اس سے کہو شادی کر لے۔ تمہارے جانے سے جو یہ گھر سونا سونا ہو گیا
 ہے، اُس کی دلہن کے آنے سے پھر رونق ہو جائے گی۔“

”میری بات کہاں مانتا ہے وہ۔“ اس نے دامن بچانا چاہا۔

”تم کہہ کر تو دیکھو، ہو سکتا ہے مان لے۔“

”اچھا! لیکن اب میری اس سے ملاقات کہاں ہو گی۔ وہ تو شام میں آئے گا۔ جبکہ مجھے

تمن بچے یہاں سے نکل جانا ہے۔“ اسے اچانک اس کی صبح والی باتیں اور رویہ یاد آیا، تو معذوری
 ظاہر کرنے لگی۔

”شام میں کیوں آئے گا۔ اسے معلوم ہے کہ آج تم نے جانا ہے۔ یقیناً دوپہر تک آ

جائے گا اور پھر تمہیں چھوڑنے بھی تو جائے گا۔“

”نہیں، صبح وہ منع کر گیا تھا۔ کہہ رہا تھا، میں تمہارا نوکر نہیں لگا ہوا۔“

”اچھا!“ ممائی جان ہنس پڑیں۔ ”یونہی مذاق میں کہہ گیا ہو گا۔“

”نہیں ممائی جان وہ سنجیدہ تھا۔“

”ارے نہیں بیٹا! تم دیکھنا، وہ ضرور آئے گا۔ سنجیدہ تو وہ زندگی میں کبھی ہوا ہی نہیں۔“

تھا۔

اس نے غور کیا تو اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ تبدیلی تو خود اس میں آئی تھی۔ اس کبھی کبھار کے خیال کی جگہ دل میں ایک کک اور خلش جاگ اُٹھی تھی کہ جب زندگی کی ناؤ کو اس کی خواہش کے عین مطابق من پسند کنار اٹل رہا تھا تو پھر امی ابو نے کسی طوفان کی طرح آکر اس کا رخ کیوں موڑ دیا۔

حیرت اسے سر پہ پر بھی تھی کہ اس نے ان تین دنوں میں ایک بار بھی گزشتہ زندگی کی کسی بات کو دہرایا نہیں تھا۔ اور کچھ نہیں تو اس پر بے وفائی کا الزام تو رکھ ہی سکتا تھا لیکن اس نے تو اپنے کسی انداز سے بھی ظاہر نہیں کیا کہ وہ کبھی اس کے سامنے اپنے جذبات کو بے نقاب کر چکا ہے۔ اور کمال ضبط کا مظاہرہ تو وہ بھی کر گئی تھی کہ ساری حقیقت جاننے کے بعد بھی اس کا سامنا کیا۔ اور یہی نہیں بلکہ نانی اماں اور ممانی جان پر بھی یہی ظاہر کیا کہ وہ ان حالات کو نہ صرف مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی ہے بلکہ مطمئن بھی ہے۔ اور اب یہاں آکر وہ پچھلے کئی دنوں سے اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ کیا واقعی وہ مطمئن ہے۔ جواب میں دل دہائیاں دینے لگتا تو وہ گھبرا جاتی۔ پریشان ہو کر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتی کہ اب جبکہ زندگی مخصوص راستوں پر چلنے لگی ہے تو وہ کیوں گزشتہ راستوں کو کھوجنے لگی ہے۔

کئی بار سوچا کہ ابو جی یا پھر آنٹی سے جا کر پوچھے کہ انہوں نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اپنے مفاد کی خاطر اسے ان محبت کرنے والی ہستیوں سے کیوں کھینچ لائے۔ لیکن ہمیشہ وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ ابو جی کے گھر جانا بالکل ہی چھوڑ دیا۔

ان دنوں مٹی اسے خاص طور سے نوٹ کر رہا تھا کہ وہ کچھ اُلجھی اُلجھی سی رہتی ہے۔ کبھی بے تحاشا بولتی جیسے اپنے اندر کی آوازوں کو دباننا چاہتی ہو۔ اور کبھی ایک دم خاموشی، جیسے اندر کی آوازوں کو دباتے دباتے تھک کر خود انہی میں کہیں کھو گئی۔

”آخر آپ کی پرابلم کیا ہے؟“ اس روز اس کی مسلسل خاموشی سے تنگ آکر وہ پوچھنے

”سنو! اب میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ بالکل خاموش ہو جاؤ۔ تم کسی اور موضوع پر بات کر سکتی ہو۔“ وہ اُسے مسلسل شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے بولا تو وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

”کبھی لاہور آؤ ناں۔ میرا مطلب ہے ہمارے گھر۔“

”وعدہ تو نہیں کرتا۔ ہاں اگر لاہور آنا ہو تو پھر تمہارے پاس بھی ضرور آؤں گا۔“ وہ

خوش دلی سے بولا۔

پھر ہوٹل سے باہر ہی گاڑی روک کر پچھلی سیٹ سے اُس کا بیگ اٹھا کر اُس کی طرف

بڑھاتا ہوا بولا۔

”خدا حافظ۔“

”کیا مطلب؟ کیا تم یہیں سے واپس چلے جاؤ گے۔“ وہ اُس کی بے مردتی پر خیران

ہو کر بولی۔

”ہاں۔“

”نہیں سرمد! یہ اچھا نہیں لگتا۔ خان صاحب کیا سوچیں گے۔“

”خان صاحب کی بہت فکر ہے تمہیں۔“ وہ چڑ گیا۔

”کیا نہیں ہونی چاہیے۔“ شاید وہ کوئی غلط بات کہنے جا رہا تھا کہ فوراً ہونٹ بھیج کر اپنی

طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ پھر اس کے ساتھ اوپر آیا تو بس کچھ دیر ہی جنید خان کے پاس

بیٹھا۔ اس کے بعد اپنے کسی کام کا بہانا کر کے چلا گیا تھا۔

☆☆☆

وہی گھر تھا جہاں تین دن پہلے تک وہ حالات سے سمجھوتا کر کے بہت حد تک مطمئن

زندگی گزار رہی تھی۔ بس کبھی کبھی یہ خیال اسے آرزو کرتا کہ اس سے اتنی محبت کرنے والی ہستیوں

نے آخر میں دودھ کی مکھی کی طرح اسے نکال پھینکا۔ ورنہ تو ہر طرح کا اطمینان ہی تھا۔ اور اب جبکہ

صرف تین دن کے بعد دوبارہ اس گھر میں آئی تو ہر شے اجنبی لگ رہی تھی۔ حالانکہ سب کچھ ویسا ہی

نہیں توجہ سے نہیں سُن رہی تھی۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“ وہ شاید ہر صورت جاننا چاہتا تھا۔ اور وہ اسے مطمئن کرنے کی غرض سے بولی۔

”اصل میں تمہارے ڈیڈی کی طرف سے فکر مند ہوں، اتنے مصروف رہتے ہیں۔ وقت کام کام اور جتنا کام کرتے ہیں، اس حساب سے آرام بالکل بھی نہیں۔ تم نے دیکھا نہیں نا کی صحت کتنی متاثر ہو رہی ہے۔“

اس نے بیٹی کو مطمئن کرنے کی غرض سے اور اپنی طرف سے اسکی توجہ ہٹانے کی خاطر انہی بات بنائی تھی کہ اچانک نانی اماں کی باتیں یاد آنے لگیں۔ انہوں نے کہا تھا۔

”خدا انخواستہ جنید خان کو کچھ ہو گیا تو اس گھر میں تمہاری جگہ نہیں رہے گی۔ البتہ جائیداد کا حصہ پیدا کر لو تو۔“

اور پھر

”اللہ نہ کرے جو تم ادھوری رہو۔“

اچانک اسے اپنے خالی پن کا احساس ہونے لگا تو وہ خاموشی سے بیٹی کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ کتنی دیر تک وہ اس نہج پر سوچتی رہی تھی۔

اس کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ بس صرف سات ماہ اور اگر حالات ایسے نہ ہوتے تو شاید ابھی وہ نئے مہمان کے بارے میں سوچتی بھی نا۔ لیکن اب نانی اماں کی باتوں نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے جائیداد کا لالچ نہیں تھا۔ البتہ وہ اپنی تکمیل ضرور چاہتی تھی۔ اسی رات جنید خان کے سامنے اس نے خاص طور سے بچوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ ان کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی۔ اور جاننا چاہتی تھی کہ آیا وہ مزید بچوں کی آرزو رکھتے ہیں یا نہیں۔ اور اسے بہت مایوسی ہوئی۔ جب انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر اگلے کئی دن تک وہ انہیں آزماتی رہی۔ کبھی بچوں کی باتیں اور کبھی بچوں کی کوئی مووی لگا دیتی۔ اور جنید خان پتہ نہیں سمجھ نہیں رہے تھے یا جان بوجھ کر

لگا۔

”کون سی پرابلم؟“ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”اس کا مطلب ہے، ایک نہیں کئی پرابلمز ہیں۔“

”پتہ نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میرا خیال ہے، آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔“

”نہیں بھئی، میں بالکل نہیں سمجھ رہی۔“

”اچھا۔“ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے آپ کراچی سے ہو کر آئی ہیں، بہت آپ سیٹ

رہنے لگی ہیں۔ اور پوچھنا یہ ہے کہ آخر وہاں ایسی کیا بات ہوئی ہے جس نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے۔“

”ارے! یہ بیٹی تو بہت تیز ہے۔“ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا اور فوراً اپنے

آپ پر قابو پاتی ہوئی مسکرا کر بولی۔

”تمہارا وہم ہے بیٹی! ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، میں بالکل بھی پریشان نہیں

ہوں۔“

”پہلے مان لیتا ہوں، لیکن پلیز آپ اتنی خاموش نہ رہا کریں، مجھے وحشت ہونے لگتی

ہے۔“

”پہلے میں زیادہ تو نہیں بولتی تھی۔“

”ہاں! لیکن سُنتی تو تھیں۔ میرا مطلب ہے توجہ سے۔ آپ میری طرف متوجہ رہتی

تھیں۔ اور اب ایسا لگتا ہے جیسے آپ صرف جسمانی طور پر میرے پاس موجود ہوں اور آپ کا

ذہن.....“

”آئی ایم سوری بیٹی!“ وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔ ”میں ان دنوں واقعی تمہاری

وئی بولی۔

”مجھے جائیداد میں سے کچھ نہیں چاہیے خان صاحب! بس ایک بچہ جو میری ماما کا ہمارا ہو۔ میرا یقین کریں، میں اپنے لیے اور اس کے لیے کچھ نہیں مانگوں گی۔“

”اچھا۔“ وہ پتہ نہیں کیوں بنے تھے۔ ”تمہیں شاید پیسے کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے۔“

جہر حال میں تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔“

وہ کروٹ بدل گئے۔ اور وہ بقیہ تمام رات آنکھوں پر بند باندھتی رہی۔

جنید خان نے اسے اندھیرے میں نہیں رکھا تھا، نہ ہی اس کا دل رکھنے کی خاطر کوئی آس دلائی تھی بلکہ انہوں نے واضح الفاظ میں اس کی خواہش رد کر دی تھی۔ اور ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ہر بات کی طرح اسے بھی نصیبت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتی۔ لیکن اس کے برعکس وہ کسی طرح بھی اس تلخ حقیقت کو قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ گو کہ کوشش ضرور کر رہی تھی کہ اپنے اندر ہمت کے جذبے کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دے۔ لیکن جتنا وہ اس جذبے کو دباتی، اتنا زیادہ وہ سر اُبھارتا۔ اور وہ بے چین ہو جاتی۔

کوئی معصوم فرشتہ، کوئی ننھا منسا وجود اس کی آغوش میں سمائے تو اسے اپنا آپ معتبر لگے۔

”کیا وہ کبھی معتبر نہیں ہوگی؟“ وہ سوچتی۔

کیا اس کی سماعتیں ہمیشہ ایک لفظ ماں سننے کو ترستی رہیں گی۔

کوئی تو ہو جو میرے تڑپتے پھلتے جذبے کو فقط ایک لفظ سے شانتی بخش دے۔

اور پھر وہ سکون ڈھونڈتی ہوئی بنی کے پاس جا بیٹھی۔ اس اتنے بڑے گھر میں ایک وہی تو تھا جو اپنی کہتا تو اس کی بھی سنتا تھا۔ اس کی وہیل چیئر کے آگے گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور اس کے مضبوط ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتی ہوئی بولی

”سنو بنی! تمہیں یاد ہے اول روز تم نے پوچھا تھا کہ تم مجھے کیا کہہ کر مخاطب کیا کرو۔“

انجان بن رہے تھے۔ بہر حال وہ خاصی دلبرداشتہ ہوئی۔ اور ایک آخری خواہش کے طور پر اُن سے صاف بات کرنے کی جرات کر بیٹھی۔

”خان صاحب! میں اپنی تکمیل چاہتی ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”میں!“ وہ ہچکچائی تھی۔ ”میرا مطلب ہے، میں ماں بننا چاہتی ہوں۔“

”ارے!“ جنید خان کا تہقہ بے ساختہ تھا۔ ”میری بیوی بنتے ہی تم نہ صرف ماں بلکہ

نانی اور دادی بھی بن گئی تھیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے خان صاحب! لیکن میں اپنے بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں، جو میری کوکھ سے جنم لے اور میری آغوش میں پرورش پائے۔“

”کم آن سویٹی!“ انہوں نے ٹوکا۔ ”صرف اپنے بارے میں نہیں، میرے بارے میں بھی سوچو۔ اب اس عمر میں شیر خوار بچے کا باپ کہلاتا اچھا لگوں گا کیا؟“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

”فریہ پہلے ہی خفا ہے کہ میں نے اس عمر میں شادی کیوں کی۔ اب اگر بچے پیدا کرنے لگوں تو.....“

”صرف ایک۔“ وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔

”اسپاسمیل!“ پیشانی شکن آلود اور لہجے کی سختی نے اسے نہ صرف اندر تک دہلا دیا بلکہ باور بھی کرا دیا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی بات نہ اب نہ آئندہ کبھی نہیں سنیں گے۔ وہ سر جھکا کر اپنے اندر ہمت کے جذبات کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگی تھی کہ وہ کہنے لگے۔

”سنو! تمہیں صرف ماں بننے کی خواہش ہے یا میری جائیداد میں حصہ دار پیدا کرنا

چاہتی ہو؟“

”میرے خدا!“ اسے حیرت کے ساتھ دکھ بھی ہوا۔ تاسف بھری نظروں سے دیکھتی

”ہاں اور شاید آپ نے کہا تھا جو بھی نام دو لیکن اتنا خیال رکھنا کہ میری عزت نفس مجروح نہ ہو۔“ وہ سوچتا ہوا بولا۔

”ہاں۔ میں نے ایسا ہی کہا تھا۔ پھر تم نے مجھے کوئی نام کیوں نہیں دیا؟“

”بس یونہی۔“ وہ اس کی حالت سے بے خبر لا پرواہی سے بولا۔

”یونہی!!“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی وہ اس کی طرف دیکھے گئی۔ وہ کوئی ننھا منسا معصوم فرشتہ نہیں تھا جو اس کی آغوش میں سما جاتا۔ اور جسے وہ سینے میں بھینچ کر مامتا کی پیاس بجھاتی۔ وہ تو بس اس سے چند برس ہی چھوٹا تھا۔ پھر بھی اس کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بولی۔

”سنو! تم مجھے ماں کیوں نہیں کہتے؟“

”ماں!“ وہ شاید ہنسنا چاہتا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں ہنس نہیں سکا۔

”ہاں ہنٹی! تم مجھے می کہو یا ممانیا ایسا ہی کوئی لفظ جو تمہیں اچھا لگے۔“

”اچھا!“ وہ ہلکے سے مسکرایا۔ ”مجھے آپ کو ماما کہنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ وہ بے تابی سے بولی۔

”آپ میری ماما لگتی نہیں ہیں۔“

”تمہاری ماما تو بہت خوبصورت ہوں گی۔“ وہ غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھونے لگی۔

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ وہ اس کی حرکت سے محفوظ ہو کر بولا۔

”میرا مطلب ہے عمر میں آپ مجھ سے اتنی بڑی نہیں ہے۔“

”تو کیا ہوا؟“ وہ جلدی سے بولی۔ ”ہوں تو میں تمہاری ماما اور جب تم اس رشتے کو

تسلیم بھی کر رہے ہو تو پھر ماما کہنے میں کیا حرج ہے۔“

”آپ کو برا نہیں لگے گا؟“

”نہیں بھئی، میں خود تم سے کہہ رہی ہوں اور مجھے بہت اچھا لگے گا۔“

”اچھا تو ماما جی! اب آپ یہاں سے اٹھ کر اوپر بیٹھیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا

کہ میری ماں میرے پیروں کے پاس بیٹھی ہے۔“

وہ اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھانے کی کوشش کرتا ہوا بولا تو وہ یکدم بے اختیار ہو

گئی۔ اس کے ہاتھ تھام کر کبھی ہونٹوں سے لگاتی اور کبھی آنکھوں سے۔ اور ہنٹی اس کی کیفیت اور

والہانہ انداز پر حیران ہو رہا تھا۔

اُس نے زندگی میں کبھی بہت زیادہ کی آرزو نہیں کی تھی۔ بس جو مل گیا اسی پر قناعت

کرتی۔ ہو سکتا ہے قناعت کرنا اس کی مجبوری رہی ہو۔ کیونکہ دنیا میں واحد ہستی ابو جی جن پر وہ حق

رکھتی تھی اور انہوں نے کبھی اس کی خبر نہیں لی۔ جو خبر گیری کرتے تھے، ان پر ابو جی جتنا حق بہر حال

نہیں تھا۔ اس لیے ان کی طرف سے جو مل گیا، اسے ہی بہت سمجھ لیا۔ اور اب ہنٹی پر بھی اسے اتنا حق

نہیں تھا جتنا کہ اپنی پیٹ کی اولاد پر حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی طرف سے محبت کے چند

بولوں کو اس نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ پتہ نہیں اس کی ماما کے تڑپتے مچلتے جذبے کو تسکین ملی تھی کہ

نہیں، لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ مطمئن ہونے لگی تھی کہ چلو کوئی ماں کہنے والا تو ہے۔

کیا ہوا جو وہ اسے جہنم دینے کی سزاوار نہیں ہوئی!

کیا ہوا جو وہ اسے اپنی آغوش میں نہیں سیٹھ سکتی!

اور۔

کیا ہوا جو اس کی آبیاری اس نے اپنے لہو سے نہیں کی!

یہی بہت ہے کہ اس نے ماں کہہ کر ادھورے پن کے احساس کو مٹا دیا ہے۔ ان دنوں

وہ کچھ گمنامی ہو کر ہنٹی کی ناز برداریوں میں مصروف تھی، جیسا اس نے غور ہی نہیں کیا کہ جنید خان کچھ

تھکے تھکے سے رہنے لگے ہیں۔ وہ جو اپنی عمر سے دس سال کم نظر آتے تھے، اب اتنے ہی برس آگے

جا کھڑے ہوئے ہیں۔

”کچھ نہیں، بس سینے میں معمولی سا درد تھا تو چیک اپ کے لیے چلا آیا۔“
اسی وقت ڈاکٹر صاحب اندر آئے تو جنید خان کے ساتھ وہ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئی
اور ڈاکٹر صاحب آتے ہی کہنے لگے۔

”خان صاحب! اب مزید تاخیر آپ کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ آپ کو فوراً بائی پاس
کے لیے لندن جانا چاہیے۔“

جنید خان نے اثبات میں سر ہلایا، پھر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”ڈاکٹر یونس! ان سے ملیں۔ یہ میری مسز ہیں۔“

”ہاؤ آر یو؟“ ڈاکٹر یونس اس کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے۔

”فائن تھینک یو۔“

”مسز خان! آپ میرے ساتھ آئیں۔“ ڈاکٹر یونس نے کہا تو وہ جنید خان کی طرف
دیکھنے لگی، پھر ان کا اشارہ پا کر ڈاکٹر صاحب کے پیچھے چل پڑی۔ ڈاکٹر یونس اسے لے کر اپنے
کمرے میں آئے اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

”جنید خان اپنی صحت پر بزنس کو ترجیح دے رہے ہیں، انہیں ہارٹ بڑیل کی شکایت
ہے۔ اور میں گزشتہ تین ماہ سے انہیں بائی پاس کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اور وہ ہیں کہ آج کل پرٹالتے
جارہے ہیں۔ آپ پلیز انہیں سمجھائیں مسز خان! کہ مزید تاخیر سخت نقصان دہ ہوگی۔“ وہ قدرے
توقف کے بعد کہنے لگے۔

”میں کچھ میڈیسن لکھ کر دے رہا ہوں یہ پابندی سے استعمال کرائیں اور اس ہفتے مکمل
ریسٹ کرائیں۔ کسی قسم کی کوئی ٹینشن نہیں ہونی چاہیے۔ اور اگلے ہفتے انہیں لندن میں ہونا
چاہیے۔ میں وہاں کے ڈاکٹرز سے بات کر کے آپ کو مطلع کر دوں گا۔“

بات کے اختتام پر انہوں نے بغور اس کی طرف دیکھا، وہ گم سم بیٹھی تھی۔

”مسز خان!“ انہوں نے متوجہ کیا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

اس روز وہ جنید خان کے آفس جانے کے بعد بنٹی کے ساتھ بیٹھی کوئی مووی دیکھ رہی تھی
کہ فون کی بیل سن کر اٹھ کھڑی ہوئی تو دوسری طرف جنید خان کا پی اے تھا۔ اس نے بتایا کہ جنید
خان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ اس وقت ہسپتال میں ہیں۔
”کیا ہوا ہے انہیں؟“ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

اور اس سے ہسپتال کا معلوم کر کے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہا۔ اور جلدی سے
بنٹی کے پاس آکر اسے بتانے لگی۔

”سنو بنٹی! تمہارے ڈیڈی ہسپتال میں ہیں اور میں ان کے پاس جا رہی ہوں۔“
پریشانی اس کے چہرے اور آواز میں بھی سمٹ آئی تھی جبکہ بنٹی نے بڑے سکون سے اس خبر کو سنا اور
اطمینان سے کہنے لگا۔

”کم آن ماما! وہ یونہی چیک اپ کے لیے گئے ہوں گے۔“

”نہیں بنٹی! ان کے پی اے کا فون تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ ان کی طبیعت خراب
ہے۔“

”اچھا!“ اس نے پھر بھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ ”کام کی ٹینشن ہوگی اور پلیز آپ
اتنی پریشان نہ ہوں۔“

وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ ڈرائیور گاڑی لیے منتظر تھا۔ وہ اسے ہسپتال کا بتا کر بیٹھ
گئی۔ جنید خان کے پاس پہنچی تو انہوں نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر پوچھنے لگے۔

”تم یہاں کیسے آئیں؟ میرا مطلب ہے تمہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟“

”آپ کیسے ہیں خان صاحب؟“ وہ ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”ایک دم فرسٹ کلاس!“ یہ نہیں، انہوں نے لہجے کو فریش رکھنے کی کامیاب کوشش کی

تھی یا واقعی وہ اتنے فریش تھے، وہ سمجھ نہیں سکی۔

”کیا ہوا ہے آپ کو؟“ وہ اب بھی پریشان تھی۔

لندن جانے کے لیے بھی آمادہ کرتی رہی تھی، جس کے لیے وہ پہلے بالکل تیار نہیں تھے۔ محض اپنے بزنس کی وجہ سے اور لندن جانے کو وقت کا زیاں سمجھ رہے تھے۔ بہر حال وہ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور جس روز وہ ان کے ساتھ جانے والی تھی اس روز سمد کافون آگیا۔ اتفاق سے اسی نے ریسو کیا تھا۔ اور اس کی آواز سنتے ہی وہ کہنے لگا۔

”کیا بات ہے، بہت مصروف رہنے لگی ہو؟“

”کیا مطلب؟“

”میں پہلے بھی دو تین بار فون کر چکا ہوں۔ لیکن تم سے بات نہ ہو سکی کیونکہ تمہارے ملازم نے تمہیں بلانے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ تم بہت مصروف ہو۔“

”ہاں! اصل میں خان صاحب! وہ اپنی مصروفیت کا سبب بتانا چاہتی تھی کہ وہ بول

پڑا۔

”کیا ہوا فوت ہو گئے تمہارے خان صاحب؟“

”اللہ نہ کرے!“ وہ بے اختیار بولی اور بے اختیار ہی رو پڑی۔

”ارے ہیلو جیو۔ ہیلو۔“

”تم نے ایسی بات کیوں کہی؟“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”آئی ایم سوری۔ میں نے تو یونہی مذاق میں۔“

”میں مذاق میں بھی ایسی بات نہیں سن سکتی۔ سمجھے تم!“

”سنو! تمہیں کیا خان صاحب سے بہت محبت ہے؟“

”ہاں! اس لیے کہ وہ میرا سہاگ ہیں، میرا سائبان ہیں اور اس سائبان سے نکل کر

پوری دنیا میں میرے لیے کہیں امان نہیں۔“

قدرے توقف کے بعد اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”یہ بتاؤ تم نے فون کیوں کیا تھا؟“

”اپنی پرابلم؟“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ میری بات سن رہی تھیں۔“ وہ پوچھنے لگے۔

”جی!“

”ذرا بتائیے تو میں نے کیا کہا ہے؟“

”اگلے ہفتے خان صاحب کو لندن میں ہونا چاہیے۔“ اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

”کس سلسلے میں؟“

”بائی پاس کے لیے۔“

”ہاں!“ انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا کہ بظاہر وہ کسی طرح بھی ان کی طرف

متوجہ نہیں لگ رہی تھی۔

”اب میں جاؤں؟“ وہ اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ہاں! اور پلیز خیال رکھیے گا خان صاحب کے لیے ریٹ بہت ضروری ہے۔ میرا یہ

خیال تھا کہ وہ یہیں رہتے۔ لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں، میں ان کا خیال رکھوں گی۔“ اس نے یقین دلایا اور ان کے کمرے

سے نکل آئی۔

پھر پورا ہفتہ اس نے ڈاکٹر یونس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے جنید خان کو مکمل ریٹ

دیا۔ یہاں تک کہ ان کا پی اے آفس کی کوئی انتہائی ضروری فائل لے کر بھی آتا کہ اس پر جنید خان

کے سائن کروانے ہیں تو وہ اسے بھی باہر ہی سے لوٹا دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ فائل ہاتھ میں لیتے ہی

جنید خان کو بہت سارے کام یاد آ جائیں گے اور اگر وہ خود نہ بھی گئے تو اس مینشن میں ضرور مبتلا

ہو جائیں گے کہ پتہ نہیں ان کا وہ کام ہوا کہ نہیں۔ اور کسی بھی قسم کی مینشن ان کے لیے سخت نقصان

دہ تھی۔ وہ انہیں بالکل بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہی تھی کہ بعض اوقات تو وہ جھنجھلا جاتے اور کچھ

شائستہ قسم کی گالیوں سے بھی نواز دیتے۔ وہ سب کچھ خاموشی سے سن لیتی۔ اس دوران وہ انہیں

مکتی تھی اور نہ ہی قریب جا کر انہیں دیکھ سکتی تھی تو پھر ہاسپٹل جانے کا کیا فائدہ۔ دن میں ۱۰ تا ۱۲ بار دن کر کے ان کے بارے میں معلوم کر لیتی۔

انسان جب تنہا ہوتا ہے تو بہت ساری سوچیں اور خیالات ایک دم اس پر حملہ آور ہو پاتے ہیں۔ وہ باتیں جنہیں انسان کبھی فراغت میں بیٹھ کر سوچنا چاہتا ہے اور وہ باتیں جنہیں کبھی سوچنا نہیں چاہتا، وہ سب ایک ساتھ ذہن کے درپوں پر دستک دینے لگتیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایسا ہی ہوا۔ ایک تو فراغت دوسری تنہائی جس نے عہد رفتہ سے اس کا ناتا جوڑ دیا۔ بہت ماری یادیں، بہت ساری باتیں اور ان سب پر حاوی نانی اماں کی ایک بات۔۔۔۔

”خدا نخواستہ! جنید کو کچھ ہو گیا تو اس گھر میں تمہاری جگہ نہیں رہے گی۔“
اس ایک بات نے اسے اتنا پریشان کیا تھا کہ پھر وہ ساری باتیں بھلا کر مسلسل جنید خان کی زندگی کی دعائیں مانگتی رہی تھی۔

وہ یقیناً ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جنہیں زندگی میں خواہش کے برعکس بھی کچھ ملے تو وہ اسے نصیب کا لکھا سمجھ کر جی جان سے قبول کر لیتی ہیں۔ اس نے صرف اس وقت آنسو بہائے تھے جب آنٹی نے بتایا تھا کہ ممائی جان اسے رجسٹر کر چکی ہیں۔ یا پھر اس وقت جب نانی اماں اور ممائی جان کی زبانی اسے صحیح صورت حال کا پتہ چلا تھا۔ وہ آزرہ ضرور ہوئی تھی۔ اور کئی دن تک اپنے ساتھ ہونے والے تقدیر کے مذاق پر کڑھتی بھی رہی تھی لیکن جنید خان سے پھر بھی متنفر نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کے لیے غلط انداز سے سوچا تھا۔ انہیں تو ایجاب و قبول کے مراحل سے گزرتے ہی اس نے اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ اور خالص مشرقی لڑکیوں کے انداز میں سوچتے ہوئے شاید اس کا ایمان تھا کہ جس گھر میں اس کی ڈولی اُتری ہے، وہاں سے اب اس کا جنازہ ہی نکلے گا۔

اکثر مائیں، بیٹیوں کو اسی قسم کی نصیحتیں کیا کرتی ہیں۔ اور پھر اس نے تو نانی اماں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ یقیناً انہوں نے ہی اس کی گھٹی میں یہ بات بٹھائی تھی اور اب انہوں نے ہی اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ جنید خان کے بعد اس کا کیا ہوگا؟ وہ اندر تک دہل گئی تھی۔

”میں ایک کام کے سلسلے میں لاہور آ رہا ہوں۔ پوچھنا یہ تھا کہ تم سے ملاقات ہو سکے گی؟“

”تم اگر میرے گھر آنا چاہو تو ضرور آؤ لیکن مجھ سے ملاقات یوں نہیں ہو سکے گی کہ میں آج خان صاحب کے ساتھ لندن جا رہی ہوں۔“
”کس سلسلے میں؟“

”خان صاحب کے بانی پاس کے لیے۔“
”ارے!“ وہ شاید اسے حوصلہ دینے کو الفاظ ڈھونڈنے لگا تھا کہ وہ کہنے لگی۔
”دعا کرنا سرمد! اللہ میاں مجھے کسی آزمائش میں نہ ڈالے۔ میرا سائبان میری چھت ہمیشہ سلامت رہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے بہت آہستگی سے ریسور کریدل پر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

اس نے اپنی زندگی میں اتنے تنہا، اُداس اور فارغ دن نہیں گزارے تھے، جتنے کہ لندن میں قیام کے دوران گزارے۔ بس پہلے دن ہی وہ جنید خان کے ساتھ ہاسپٹل گئی تھی۔ اس کے بعد اسے ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ان کی تیمارداری کو وہیں ان کے پاس موجود رہے گی لیکن اس کی اجازت نہیں تھی۔ بانی پاس کے بعد وہ ایک بار انہیں دیکھنے کی غرض سے گئی تھی۔ ریسپشن پر جا کر جب اس نے جنید خان کا نام لیا تو وہاں موجود لڑکی نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک مٹن آن کیا اور سامنے اسکرین روشن ہو گئی۔ اس نے دیکھا جنید خان سو رہے تھے اور ان سے متعلق ہدایات کا چارٹ جسے وہ لڑکی روڈی سے پڑھ کر اسے سنانے لگی۔

”کیا میں ان سے مل سکتی ہوں۔“ اس کے خاموش ہوتے ہی وہ پوچھنے لگی۔
”سوری!“ لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔

ساتھ ہی اس کی سہولت کے لیے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ یہاں آنے کی بجائے فون کر کے ان کے بارے میں معلوم کر لیا کرے۔ پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ ظاہر ہے جب وہ ان سے مل نہیں

”یہ بتاؤ، تم نے میرے لیے کتنی دعائیں مانگیں۔“

”بے شمار، نہ صرف دعائیں بلکہ غنیمتیں بھی جو گھر جا کر پوری کروں گی۔“

”کیوں؟ میرا مطلب ہے تمہیں میری زندگی سے کیا فائدہ ہے؟“ بالآخر بزنس میں بے سود و زیاں کی بات ضرور کرتا ہے۔

”فائدہ!“ وہ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ”میں کسی فائدے نقصان کو نہیں قی خان صاحب! میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ میرا سائبان ہیں۔ اور ہمارا معاشرہ بے نہان عورت کو کوئی مقام نہیں دیتا۔“

”تم اس انداز سے سوچتی ہو؟“

”ہاں! مجھے اسی انداز سے سوچنا سکھایا گیا ہے۔“ پھر براہ راست ان کی آنکھوں میں ہمتی ہوئی پوچھنے لگی۔

”کیوں، کیا میرے سوچنے کا انداز غلط ہے؟“

”نہیں۔“ وہ ہلکے سے مسکرائے تھے۔

☆☆☆

انہوں نے اپنی واپسی کی اطلاع نہیں دی تھی۔ بس اچانک ہی آگئے تھے۔ لیکن گھر میں بک کو موجود دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فرحیہ اپنے بچوں سمیت موجود تھی۔ اسی طرح طاہر خان بھی بی بی بچوں سمیت اسلام آباد سے آیا ہوا تھا اور آصف خان کراچی سے۔ یوں جیسے ان سب کو جنید ان کی واپسی کی اطلاع مل گئی ہو اور وہ اس کے استقبال کو موجود ہوں۔ ایک افراتفری اور خوشگوار نے ہنگامے کا سا سماں تھا۔ جنید خان جس وقت اس کا ہاتھ تھامے ہوئے بڑے ہال کمرے میں اخل ہوئے تو لمحہ بھر کو سب خاموش ہو کر اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر سب سے پہلے فرحیہ مامے پر جوش انداز میں آگے بڑھی۔

”ویکم ڈیڑی! کیسے ہیں آپ؟“

”اللہ نہ کرے جو جنید خان کو کچھ ہو۔“ اس کے دل سے ہر دم ایسی ہی صدائیں نکلتی

تھیں۔

جس روز جنید خان ڈسچارج ہوئے، وہ اسی وقت ان سے مل سکی اور اس تمام عرصے میں پہلی بار وہ بے اختیار ان کے سینے میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

”ارے کیا ہوا بھئی!“ وہ قدرے حیرت سے پوچھنے لگے۔

”خان صاحب! میں آپ کی طرف سے بہت پریشان تھی۔“

”کم آن سوئی! اب تو میں ٹھیک ہوں۔“

”ہاں! اللہ کا شکر ہے۔“ وہ آنسو پونچھ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ چہرے کی رنگت

قدرے زردی مائل ہو رہی تھی۔ اور کچھ کمزور بھی لگ رہے تھے۔ وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

”اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے۔“

”ارے!“ وہ ہنسے پھر بغور اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ عام سی لڑکی جس میں متاثر

کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اور پھر جنید خان عمر کے اس حصے میں تھے جہاں صنف مخالف میں کشش محسوس ہوتی بھی ہے تو دل بے اختیار نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی طرف لپکتا ہے۔ اور وہ تو عام سی لڑکی تھی جس سے شادی بھی انہوں نے محض بنی کی وجہ سے کی تھی کہ وہ بہت تنہائی محسوس کرتا تھا۔ اور کوئی گورنس اس کے پاس زیادہ دن تک نہیں رہتی تھی۔ یوں وہ بیوی لا کر قدرے مطمئن ہو گئے کہ کم از کم وہ گورنس کی طرح چھوڑ کر جائے گی تو نہیں۔ اور اب وہ حیران ہونے کے ساتھ دل ہی دل میں خاصے پشیمان بھی ہو رہے تھے کہ جسے انہوں نے کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا وہ کتنے خلوص سے انہیں اپنی زندگی کی دعا دے رہی تھی۔

”آپ کیا سوچنے لگے؟“ وہ ایک ٹک انہیں اپنی طرف دیکھتے پا کر سادگی سے پوچھنے

لگی تو وہ چونک گئے۔

”نہیں، سب ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہیں۔“
 ”ہاں۔ یہ سب جب اکٹھے ہوتے ہیں تو یونہی رات رات بھر محفل جمائے رکھتے ہیں۔“ پھر اٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

”آؤ ہم بھی کچھ دیر ان کی محفل میں بیٹھ آئیں۔“
 ”آپ کے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔“ اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔
 ”اب تو سونا ہی سونا ہے۔“ انہوں نے کہا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کمرے سے نکل آئے۔ ٹی وی لاؤنچ سے گزر کر گیلری میں داخل ہوئے تو ڈرائینگ روم سے آتی آوازوں پر اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ پھر آگے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ٹھٹھک کر رُک گئے۔ طاہر خان کہہ رہا تھا۔

”یار! ڈیڈی نے زندہ واپس آ کر تو ہمارا سارا پروگرام خراب کر دیا۔“
 ”اور کیا؟“ فرحیہ کے لہجے میں بھی مایوسی تھی۔ ”میں تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ اب ان کی ڈیڈی باڈی ہی دیکھنے کو ملے گی، اس پر دو چار آنسو بہائیں گے اور پھر.....“
 ”میں تو اب آنسو بہا رہا ہوں۔“ یہ آصف خان تھا۔ ”پتہ ہے میں نے تو عاشی سے یہ کہا ہے کہ کراچی والا پروجیکٹ میری ذاتی ملکیت ہے۔ اب اگر اسے یہ معلوم ہوگا کہ وہ میرا نہیں، میرے ڈیڈی کا ہے تو میری کتنی سکی ہوگی۔“
 ”چہ۔ چہ۔“ فرحیہ نے افسوس کا اظہار کیا۔ پھر طاہر خان سے کہنے لگی۔ ”سنو! تم نے ڈیڈی کے بینک بیلنس کا پتہ کیا تھا؟“

”نہیں، یہ کام صبح کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن اب کیا فائدہ اب تو وہ آئی گئے ہیں۔“
 ”زندہ سلامت۔“ آصف خان کے جملے کئے لہجے پر باقی سب ہنسنے لگے تھے۔ اور وہ جو سانس روکے کھڑی تھی۔ اپنے کندھے پر دباؤ محسوس کر کے فوراً جنید خان کی طرف دیکھنے لگی۔ جانے کیا تھا ان کے چہرے پر، ان کی آنکھوں میں کہ وہ ان کی کمر کے گرد بازو ڈال کر پلٹی اور

”فائن بیٹا! آپ کیسے ہو؟“ جنید خان نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر فرحیہ کو اپنے ساتھ لگایا۔
 پھر باری باری سب آگے بڑھ آئے اور ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگے۔
 ”خان صاحب پلیز! آپ بیٹھ جائیں۔“ اس نے کہا تو سب کو خیال آیا۔
 ”ہاں ڈیڈی! آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔“ وہ بیٹھے تو پوچھنے لگے۔
 ”تم سب کو ہماری آمد کا کیسے معلوم ہوا جبکہ ہم نے تو اطلاع ہی نہیں دی تھی۔“
 ”دیکھ لیں ڈیڈی! ہمارا اکمال۔“ فرحیہ اتر کر بولی۔
 ”آپ نے اطلاع نہیں دی تھی لیکن ہم نے پھر بھی معلوم کر لیا۔“
 ”اور پتہ ہے ڈیڈی! طاہر خان کی بیوی سارہ کہنے لگی۔ ”ہم آپ کی صحت یا بی کی خوشی میں زبردست پارٹی ارنج کریں گے۔“

پھر کتنی دیر تک وہ سب اسی قسم کی باتیں کرتے رہے اور جنید خان مسکرا کر اپنی اولاد کا جوش و خروش دیکھ رہے تھے، جبکہ وہ ان سب کے درمیان اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہی تھی کیونکہ کسی نے ایک بار بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ بیٹی نے بھی نہیں اور جنید خان تو شاید بھول گئے تھے کہ وہ بھی یہاں موجود ہے۔

رات میں جس وقت وہ سب کی طرف سے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تو دیکھا جنید خان کوئی فائل دیکھنے میں مصروف تھے۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھ آئی اور ان کے ہاتھ سے فائل لے لی۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو کہنے لگی۔

”ابھی نہیں خان صاحب! ابھی آپ کو کوئی کام نہیں کرنا۔ آپ مکمل ریٹ کریں گے۔“

”اوکے۔“ انہوں نے بڑی جلدی ہتھیار ڈال دیے اور فائل اس کے ہاتھ سے لے کر بریف کیس میں رکھتے ہوئے بولے۔
 ”بچے سو گئے کیا؟“

کچھ تھا۔

پھر جب لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ سب بہن بھائی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ شاید جائیداد کو نئے سرے سے آپس میں تقسیم کر رہے تھے۔ اس نے کچن سے آتے ہوئے ایک نظر ان سب کو دیکھا۔

اور بے شمار اندیشوں میں گھر کر اپنے کمرے میں جانے کو تھی کہ فرحیہ نے اسے پکار لیا۔ وہ وہیں سے پلٹ کر بے حد خاموش نظروں سے دیکھنے لگی

”یہاں آؤ“ فرحیہ نے زعب سے یوں بلایا جیسے کسی ملازمہ کو بلارہی ہو۔ وہ کچھ سہمی ہوئی سی آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آکھڑی ہوئی تو وہ کہنے لگی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”میں۔“ وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ، ”سادگی سے بولی۔“ میں اپنے کمرے میں جا رہی

ہوں۔“

”تمہارے باپ کا کمرہ ہے کیا؟“ فرحیہ کے تیز لہجے پر آصف خان اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

”کم آن فرحیہ! اس طرح بات مت کرو۔ ٹھہرو میں اسے سمجھاتا ہوں۔“

”تم رہنے دو۔ میں خود بات کروں گی۔“ فرحیہ نے آصف خان کو ٹوکا۔ پھر اس سے

کہنے لگی۔

”دیکھو! تمہارا رشتہ صرف ڈیڈی سے تھا۔ اب وہی نہیں رہے تو تمہارا یہاں کیا کام۔

اپنے گھر کا راستہ لو۔“

”اپنے گھر کا!!“ وہ زبرد بڑبڑائی، پھر ساری ہمتیں مجتمع کر کے کہنے لگی۔ ”میرا گھر

یہی ہے اور مجھے یہاں سے کہیں نہیں جانا۔“

”ارے واہ! یہ میسنی تو بڑی تیز ہے۔“ فرحیہ نے باقیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا

دوبارہ انہیں اپنے کمرے میں لے آئی۔ احتیاط سے بیڈ پر لٹایا تو وہ کہنے لگے۔

”یہ سب کچھ انہی کا تو ہے پھر.....“

”ریلیکس خان صاحب! پلیز۔ آپ کچھ نہ سوچیں۔ یہ سب نادان ہیں۔ ٹھہریں میں

آپ کے لیے دودھ میں گلوکوز ملا کر لاتی ہوں۔“

وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد دودھ کا گلاس لیے واپس آئی تو جنید خان

فون پر کسی سے کہہ رہے تھے۔

”ہاں بس اسے بے سائبان نہیں ہونا چاہیے، یہ گھر اور ٹیکسٹائل مل!“ ریسپور ہاتھ سے

چھوٹ کر نیچے جا کر اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام لیا۔

”خان صاحب!“ وہ فوراً آگے بڑھی۔ اور ان کے جھٹکے کھاتے وجود کو اپنے بازوؤں

میں لینے کی ناکام کوشش کے ساتھ ہی اسکے حلق سے چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اور اس کی چیخوں کی

آواز سن کر ہی سب بھاگے آئے تھے۔

”آصف خان! ڈاکٹر کو بلاؤ۔“ اس نے چیخ کر کہا اور ڈاکٹر کے آنے تک یہ شدید

ہارٹ اٹیک جنید خان کی جان لے گیا۔ ڈاکٹر ان کی نبض دیکھنے کے بعد ان کی موت کی تصدیق کر

رہا تھا۔ اور وہ یک دم گم غم ہو گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھا۔ جو یقیناً اپنے آپ کو

آنسو بہانے کے لیے تیار کر رہے تھے۔

☆☆☆

کئی دن لوگ تعزیت کے لیے آتے رہے۔ اس کے ابو جی اور آنٹی بھی آئے تھے۔ اور

وہ اس امید پر بار بار ان کی طرف دیکھتی رہی کہ شاید وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہیں گے

لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی بلکہ اس کے پاس تو بہت تھوڑی دیر بیٹھے۔ زیادہ تر جنید خان

کی اولادوں کے پاس رہے تھے۔ جو لوگوں کے سامنے غم و اندوہ کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ اسے

اوپرے طبقے کے ان خود غرض لوگوں سے کراہیت آنے لگی، جن کے نزدیک پیسہ اور جائیداد ہی سب

تھامے مہذب بنے بیٹھے تھے۔

”السلام علیکم بیگم صاحبہ!“ وہ قریب پہنچی تو وکیل صاحب اسے سلام کرتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ اس نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور پھر ان کے کہنے پر ان کے دائیں جانب خالی ٹھونے پر جا بیٹھی۔

”میرا نام ضیاء الحسن ہے اور میں جنید خان کا قانونی وکیل ہوں۔“ وکیل صاحب نے اس سے اپنا تعارف کرایا تو وہ ذرا سراسر اونچا کر کے ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کیا ہوا تھا خان صاحب کو؟ ابھی تو وہ ہائی پاس کروا کے آئے تھے، پھر اتنی جلدی یہ سب کیسے ہوا؟“ وکیل صاحب کے پوچھنے پر وہ باری باری ان کی طرف دیکھنے لگی۔ دل چاہا چیخ کر کہے۔

”ان سب کی وجہ سے، ہاں ان کی موت کے ذمہ دار یہ سب ہیں، بس وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش رہی۔“

”مجھے بے حد افسوس ہے بیگم صاحبہ! مرحوم بہت اچھے انسان تھے۔ اپنے آخری وقت میں وہ فون پر مجھ سے بات کر رہے تھے۔“

اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہو گیا تو اس نے سر تھکا لیا۔ وکیل صاحب کچھ دیر تک خاموش رہے پھر اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے کہنے لگے۔

”میں جانتا ہوں، ابھی آپ لوگوں کا زخم تازہ ہے لیکن میں بھی اپنے فرض سے مجبور ہوں۔ خان صاحب کی ہدایت تھی کہ میں جلد سے جلد آپ کی امانتیں آپ تک پہنچا دوں۔“

اس کے ساتھ ہی وکیل صاحب اونچی آواز میں جنید خان کا وصیت نامہ پڑھنے لگے۔ انہوں نے بچوں کی خواہش کے عین مطابق یعنی اسی رات جو جس پروجیکٹ یا چیز کی خواہش کر رہا تھا، اس کے نام کی تھی۔ اور آخری الفاظ یوں تھے۔

”میں فیصل آباد والی ٹیکسٹائل مل اپنی بیوی جلیلہ نواز کے نام کر رہا ہوں اور ساتھ ہی یہ

مذاق اڑایا۔

”اس سے پہلے کہ حصہ مانگنے لگے، نکال باہر کرو۔“ شائلہ نے سفاکی سے کہا تو باقی سب اس سے اتفاق کرنے لگے اور وہ ذکر قدم قدم پیچھے ہٹنے لگی۔ اسی وقت ملازم نے آکر جنید خان کے وکیل کی آمد کا بتایا تو سب ایک دم خاموش ہو گئے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے جانے کیا اشارہ کیا تو وہ جو راہ فرار ڈھونڈ رہی تھی، فوراً اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے ان سب کی باتوں نے بہت دکھ پہنچایا تھا اور وہ اپنے آپ کو ایک دم تنہا اور بے بس محسوس کر کے رو پڑی۔

”نانی اماں نے ٹھیک کہا تھا۔“ وہ روتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”کہ جنید کے بعد مجھے اس گھر میں جگہ نہیں ملے گی۔“

”لیکن میں کہاں جاؤں؟“ وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔ ”ابو جی اور آنٹی نے تو جھوٹے منہ بھی ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ اور پتہ نہیں دوبارہ ماموں جان کے گھر جانا مناسب ہے بھی

کہ نہیں۔“ وہ اپنے لیے کوئی راستہ تلاش کر رہی تھی کہ ملازم اسے بلانے آ گیا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ تھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر پوچھنے لگی۔

”بیگم صاحبہ! وکیل صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”کیوں؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”باقی سب لوگ کہاں ہیں؟“

”وہیں وکیل صاحب کے پاس موجود ہیں۔“

”اچھا تم جاؤ، میں آتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر ہاتھوں سے بال ٹھیک کیے، بورڈ پٹے کو پھیلا کر اوڑھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس نے دیکھا، وہ سب جو ابھی کچھ دیر پہلے رشتہ لحاظ بھلا کر انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اب وکیل صاحب کے سامنے

کتنے بہت سارے دن گزر گئے، وہ جو ہمیشہ سمجھوتا کر لیا کرتی تھی۔ اب ان حالات سے کسی طرح بھی سمجھوتا نہیں کر پار ہی تھی۔ ایک دم تنہا ہونے کے احساس نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور وہ زندگی سے ہی مایوس ہو گئی تھی۔ ہر وقت کمرے میں بند، چپ چاپ دیواروں کو تکا کرتی۔ کبھی ہنستی اور کبھی رونے لگتی۔ اگر کچھ دن اور وہ اسی طرح کمرے میں بند رہتی تو یقیناً پاگل ہو جاتی لیکن شاید قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ جیسی ایک دن بنی اس کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”مما! میں بالکل تنہا ہو گیا ہوں۔“ وہ اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر آرزو لہجے میں بولا۔

”ہاں ممما! کوئی بھی میرے پاس نہیں ہے۔“

”تمہارے بہن بھائی۔“

”وہ سب تو اسی روز چلے گئے تھے اور کوئی بھی مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ نہیں

ہوا۔“

”تمہیں کسی کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”یہاں رہ کر کیا کروں۔ کوئی بات کرنے والا ہی نہیں ہے۔“ وہ بہت مایوس نظر آ رہا

تھا۔

”میں جو ہوں۔“ وہ ایک دم کہہ گئی۔

”آپ تو شاید مجھے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں، جیسی تو اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا

ہے۔“

”نہیں بنی! یہ بات نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

”میں نے تو صرف اس لیے اپنے آپ کو کمرے میں مقید کر لیا ہے کہ کہیں تم یہ نہ سمجھنے لگو

کہ میں اس گھر پر قابض ہو گئی ہوں۔“

گھر جو اس کا سائبان ہے۔ اگر کسی نے جیلہ سے اس کا سائبان چھیننے کی کوشش کی تو پھر میرے وکیل ضیاء الحسن کو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کا اختیار ہے۔“

”نہیں۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”یہ مٹی گارے کی دیواریں اور چھت مجھے سائبان نہیں دے سکتیں۔ میرا سائبان تو خود جنید تھے۔ وہی نہیں رہے تو میں یہ سب لے کر کیا کروں گی۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وکیل صاحب اٹھ کر اس کے پاس چلے آئے۔ ملازم سے کہہ کر اس کے لیے پانی منگوایا اور پھر گلاس اس کے ہاتھ میں تھا کر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ اسی وقت فرجیہ نے بنی کو جانے کیا اشارہ کیا کہ وہ اپنی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

”مما پلیز! اس طرح نہ روئیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا تو وہ اور شدت سے رونے

لگی۔

”پلیز ممما! اس نے جتنی انداز اختیار کیا۔“ مجھے بے حد دکھ ہو رہا ہے اور دیکھیں ضیاء

انکل بھی آپ کے رونے سے پریشان ہو رہے ہیں۔“

اس نے بمشکل اپنی بلند ہوتی سسکیوں کو روکا اور وکیل صاحب سے معذرت کرتی ہوئی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو اس وقت جنید خان کی اولادوں پر برتری حاصل ہونے پر اطمینان ضرور محسوس کرتی لیکن وہ تھی جیلہ نواز، جس نے کبھی زیادہ کی آرزو نہیں کی تھی۔ ہمیشہ جو ملا اسی پر قناعت کی۔ خواہ خواہش کے مطابق یا خواہش کے برعکس۔ اور اب جو اسے مل رہا تھا اس کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ زندگی میں شاید پہلی بار وہ اوپر والے سے شکوہ کر۔ نہ لگی۔

”یا میرے اللہ میاں! کیا مانگا تھا میں نے۔ صرف جنید خان کی زندگی۔ کہ میرے سر پر

سائبان سلامت رہے اور ٹوٹنے والی۔ سائبان چھین لیا۔“

ہوں۔ اگر اجازت ہو تو تمہارے گھر تک چلا آؤں؟“

”آنا چاہو تو ضرور آؤ۔“ وہ اس کے پرانے لیجے میں کھو کر بولی۔

”تم سے ملاقات ہو سکے گی یا اب بھی اپنے خان صاحب کے ساتھ کہیں جا رہی ہو۔“

وہ یقیناً اس کے ساتھ ہونے والے سانحے سے لاعلم تھا، جیسی ایسی بات کر گیا۔

”میں کہیں نہیں جا رہی، تم آ جاؤ۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور کوئی

گھنٹے بھر بعد وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ حیران حیران سی اس کی طرف دیکھ گئی۔ اس ایک سال

میں کتنا بدل گیا تھا وہ۔ اس کا وہ چہرہ اب بدن قدرے فرہی مائل ہو کر اسے اپنی عمر سے چار پانچ سال

آگے لے گیا تھا۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ اس کے چہرے کو باوقار بنا رہا تھا۔

”بیٹھنے کو نہیں کہو گی؟“ وہ اسے یوں دیکھتے پا کر نظریں چراٹا ہوا بولا۔

”ہاں! بیٹھو۔“ وہ سر جھٹک کر بولی۔ ”یہ بتاؤ۔ گھر میں سب لوگ کیسے ہیں اور تمہیں

اتنے عرصے بعد میرا خیال کیسے آیا؟“

”تمہیں کسی کا خیال آتا ہے؟“ وہ اس کا محاسبہ کرنا چاہتا تھا۔

”نہیں۔“ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے وہ رو پڑی۔ ”مجھے تو خود اپنا خیال بھی

نہیں آتا۔“

”کیوں؟“ وہ اس کے رونے کی پروا نہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا تو جواب میں اس نے

اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کا احوال کہہ سنایا۔

”سجوا! وہ کس قدر حیران تھا۔“ تم تنہا اپنی ذات پر اتنے دکھ کیسے جھیل لیتی ہو۔ کم از کم

ہمیں اطلاع تو کرتیں۔“

”میرا خیال تھا، تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا۔“

”وحی تو نازل ہوتی نہیں ہم پر۔ کوئی بتاتا جب معلوم ہوتا ناں۔ اور پھر میں تو ویسے بھی

ٹریجک کے سلسلے میں جرمی نہیں کیا ہوا تھا۔ ابھی دو ہفتے پہلے لوٹا ہوں۔ بہر حال ابوجی اور امی کو اطلاع

”یہ گھر آپ ہی کا تو ہے۔“

”صرف میرا نہیں، ہم سب کا۔“

”اچھا! وہ خوش ہوا۔“ اس کا مطلب ہے آپ مجھے یہاں سے نکالیں گی نہیں۔“

”میں ایسا کیوں کروں گی بھلا؟“

”میرے بہن بھائی بھی تو آپ کے ساتھ ایسا کر رہے تھے۔“

”ان کا عمل ان کے ساتھ ہے، میرا عمل میرے ساتھ۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ

کر بیڈ سے اتر آئی اور اس کی چیئر دھکیلتی ہوئی بولی۔

”آؤ باہر چلیں۔ پتہ نہیں باہر کا موسم کیسا ہے!“

”بہت خوشگوار!“ ہنسی خوش دلی سے بولا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے پرانے معمول کی طرف لوٹ آئی۔ ایک جنید خان ہی تو نہیں تھے۔

باقی سب کچھ تو دیرپا ہی تھا اور پھر جنید خان بھی کب اسے اتنا وقت دیتے تھے۔ اکثر دوروں پر رہتے

اور یہاں ہوتے بھی تو اتنے مصروف کہ اس سے بس رکی باتیں ہی کر پاتے تھے۔ شروع سے اس کا

زیادہ وقت ہنسی کے ساتھ گزرتا تھا اور اب بھی وہی ساتھ تھا۔ پہلے اسے شبہ تھا، اب اور یقین کہ وہ

صرف ہنسی کیلئے اس گھر میں لائی گئی تھی ورنہ اگر جنید خان کو بیوی کی ضرورت ہوتی تو وہ اس جیسی

عام سی لڑکی سے شادی کیوں کرتے۔

حالات سے سمجھوتا کرنا ہمیشہ سے اس کی مجبوری رہی تھی۔ اور شاید یہ پہلا سمجھوتا تھا جسے

کرنے میں اسے کچھ وقت لگا۔ پھر بھی وہ ہمیشہ کی طرح ہار ضرور گئی۔ اس نے سوچ لیا کہ اب اسے

بقیہ زندگی یہیں گزارنی ہے، اسی گھر میں۔ ایک ایسے جوان بیٹے کے ساتھ جسے ہر قدم پر سہارے

کی ضرورت ہے۔ اور جب وہ اپنی اس سوچ کے ساتھ سمجھوتا کر کے قدرے مطمئن ہونے لگی تھی تو

ایک شام سرد کا فون آ گیا۔

”سنو! مین یہیں سے بات کر رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے تمہارے شہر میں موجود

ہے مجھے۔“

”تو پھر چھوڑو یہ سب اور میرے ساتھ چلو۔“ اس کے بے بسی سے دیکھنے پر وہ کہنے

”سُنو! ہمارا گھر چھوٹا سی لیکن دل بہت بڑے ہیں اور محبتوں سے لبریز بھی۔ اور محبتیں

ت سے نہیں خریدی جاسکتیں۔“ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں کل کی سیٹیں اوکے کروا رہا ہوں۔ تمہیں آنا ہو تو ان ساری آسائشوں کو ہمیشہ کے

ہمیشہ چھوڑ کر کل چار بجے ایئر پورٹ پر آ جانا ورنہ پھر ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔“ وہ لمبے لمبے
بھرتا ہوا کمرے سے نکل گیا اور وہ گلاس ڈور سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

سرمدا اس کے لیے سوچوں کے نئے دروازے کھول گیا تھا اور وہ اب بھتی چلی جا رہی تھی۔

ماکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کبھی سوچتی، اس کی بات مان کر ایک بار پھر نانی

ما اور ممانی جان کی شفیق پناہوں میں جا چھپے اور کبھی بننی کا خیال آتا کہ اس کے جانے سے وہ کتنا

ابو جائے گا۔ رات بھر میں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ صبح اپنے تھکے ہوئے ذہن کو فریٹش

رہنے کی غرض سے لان میں نکل آئی۔ لیکن یہاں بھی وہی سوچیں تھیں۔ جلد ہی اُسکا کردوبارہ

برآئی۔ کچن کی طرف جانا چاہتی تھی کہ بننی کے کمرے میں آہٹ سن کر رُک گئی۔

”بننی اتنی جلدی اٹھ گیا۔“ سوچتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف آئی تو دروازے کے

سب ہی ٹھٹھک کر رُک گئی۔ وہ شاید فون پر بات کر رہا تھا۔

”فرحیدہ! آئی! کہاں تھیں آپ، میں کل شام سے آپ کو رنگ کر رہا ہوں۔“

”ہاں! یہاں خاصی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس میسنی کا کزن پتہ نہیں کہاں سے آ گیا ہے۔“

”میں نے خود سُنا تھا وہ الو کا پٹھا سے میرے خلاف ور غلارہا تھا۔“

”اب میں کیا کروں، اگر وہ اس کی باتوں میں آگئی تو ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔“

اور وہ ہمیشہ تو ایسی باتوں پر خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ دروازے کو زور سے دھکا دے کر

کرتیں تو وہ تمہارے پاس ضرور آتے۔ بلکہ تمہیں اپنے ساتھ لے جاتے۔“

”اپنے ساتھ!“

”بالکل!“ وہ فوراً بول پڑا۔ ”جنید خان کے بعد تمہارا یہاں کون ہے؟“

”بننی!“

”کون بننی؟“ پھر جیسے اسے فوراً یاد آ گیا۔ ”اچھا وہ بننی، جنید کا معذور بیٹا۔ لیکن بھو! اس

کے اپنے بہن بھائی موجود ہیں پھر تمہیں کیا ضرورت ہے اس کی گورنس بننے کی۔“

”گورنس نہیں سرمدا! میں اس کی ماں ہوں۔“

”ماں!“ وہ تلخی سے ہنسا۔ ”ماں صرف جنم دینے والی ہی ہوتی ہے بھو! اور تمہیں تو یہ

بات اچھی طرح سمجھنی چاہیے تھی۔ کیا وہ عورت تمہاری ماں بنی جسے تمہارے ابو نے تمہاری ماں کی

جگہ دی۔“

”وہ عورت میری ماں نہیں بنی تو کیا ہوا، میں تو.....“

”نہیں بھو!“ وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔ ”مت اپنی زندگی برباد

کرو۔ اُس کے لیے جو اپنے ماں باپ کا بھی نہیں تھا۔ یقین کرو تمہیں وہ ماں اُس وقت تک کہے گا

جب تک یہ گھر اور ٹیکسٹائل مل تمہارے پاس ہے۔ آج اس کے نام کر دو تو تمہیں دھکے دے کر

نکال دے گا۔ اور تم جیسی بے وقوف لڑکی سے کوئی بعید نہیں کہ اس کی باتوں میں آ کر اس کے نام لکھ

بھی دو۔“

”نہیں سرمدا! بننی ایسا نہیں ہے۔ وہ تو شروع دن سے میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔“

”ہوگا، پھر بھی میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔“

”نہیں سرمدا! میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”یوں کہو۔ بڑے گھر میں رہنے کی عادی ہو گئی ہو، یہ آسائشیں وہاں نہیں مل سکتیں۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو؟“ وہ روہانسی ہو گئی۔ ”اس بڑے گھر اور ان آسائشوں نے کیا

”تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ وہ جناب آپ سے تم پر آگیا۔

”میں کیا کر سکتی ہوں۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور اس سے پہلے کہ میں تمہیں کسی کوڑے کرکٹ کی طرح اٹھوا کر باہر پھٹکوانے کا سوچوں، اپنی فرجیہ آپنی کونون کرو کہ تمہیں لے جائیں ورنہ۔۔۔۔۔“

کیا کر لوگی تم؟“ وہ چیخا۔ ”یہ سب ہمارے باپ کی جاگیر ہے اور ہم تمہیں اس پر اتنی آسانی سے قابض نہیں ہونے دیں گے۔“

”مث آپ!“ وہ اس سے اونچی آواز میں چیخی۔ ”مجھے ویسے بھی جاگیروں پر قابض ہونے کا کوئی شوق نہیں اور رہے تم! تو تم بھی اپنے دل سے یہ خیال نکال دو کہ کچھ حاصل کر سکو گے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ فون کی طرف بڑھی اور ریسور اٹھا کر وکیل ضیاء الحسن کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف جب وکیل صاحب لائن پر آگئے تو وہ کہنے لگی۔

”ضیاء صاحب! میں ہوں بحیلہ نواز۔“

”جی بیگم صاحبہ فرمائیے!“

”معاف کیجئے گا میں نے صبح ہی صبح آپ کو زحمت دی لیکن کیا کروں میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”آپ فرمائیے کیا کام ہے۔“ انہوں نے کہا تو وہ فنی پر نظریں جماتی ہوئی بولی۔

”ضیاء صاحب! میں چاہتی ہوں کہ میرا یہ گھر جہاں میں رہائش پذیر ہوں، اسے یتیم اور بے سہارا لڑکیوں کے لیے ہاسٹل بنادوں۔ اور میری ٹیکسٹائل میل کی جو سالانہ آمدنی ہے، اس میں سے پچاس فیصد ان لڑکیوں کی تعلیم اور دیگر ضروریات پر خرچ ہو، اور بقیہ پچاس فیصد مختلف مستحق اداروں کو دیا جائے۔“

”تو بیگم صاحبہ! آپ کہاں جائیں گی؟“ وکیل صاحب شاید مذاق سمجھے تھے۔

”میں انہی راہوں پر لوٹ رہی ہوں، جہاں قدم قدم پر محبتوں کے پھول کھلتے ہیں۔“

اندر داخل ہوگئی اور اسے دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ فوراً ریسور رکھ کر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔
”ارے ماما! آپ اتنی جلدی اٹھ گئیں۔“

”مما نہیں میسنی کہو۔“ اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اس انداز سے بات نہیں کی تھی۔ دانتوں کو ایک دوسرے پر جما کر اور آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کر۔

”کیا مطلب؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ فنی نے انجان اور معصوم بننے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔

”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور مزید کیا کہنے والی ہوں۔ اگر سننے کا حوصلہ ہے تو سنو۔ ورنہ ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے۔“

”میں بالکل نہیں سمجھا۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”کیا سمجھاؤں تمہیں۔ ارے تم تو یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ مجھے تم سے ہمدردی نہیں تھی۔ میں نے سچ مچ تم پر اپنی مانتا لٹائی تھی۔ اور جس پر مانتا لٹائی جائے اس پر جان بھی نچھاور کر دی جاتی ہے۔ یہ گھر، جاگیر کیا چیز ہے۔“

”مما!“

”مت کہو مجھے ماما! میں تمہاری ماں نہیں ہوں اور تمہارے جیسی، رشتوں کا تقدس پامال کرنے والی میری اپنی لگی اولاد بھی ہوتی تو میں اس کا بھی گلاد ہا دیتی۔“

اس کی آواز بھڑائی تو اس کی طرف سے رخ موڑتے ہوئے بولی۔

”تم نے مجھے بہت دکھ پہنچایا ہے فنی! اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ بہت زیادہ اور جلد سے جلد حاصل کر لینے کی ہوس نے تم سب کو اندھا کر دیا ہے۔ ارے یہ

سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ پھر..... لیکن نہیں۔ میں جنید خان نہیں ہوں جو تم لوگوں کی حقیقت جاننے کے بعد بھی اتنا کچھ تمہارے نام لکھ گئے۔ میں اس ساری دولت اور جائیداد کو اپنے ہاتھوں سے

آگ لگا دوں گی لیکن تمہارے حوالے نہیں کروں گی۔“

”میں آگئی ہوں سرمد! ان ساری آسائشوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر۔“ وہ کتنی دیر تک بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک ساتھ کئی چراغ جل اٹھے۔ جانے کب سے سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کی۔ پھر جھک کر بریف کیس اٹھایا اور قدم بڑھاتا ہوا قدرے شرارت سے بولا۔

”آؤ گئی ہو لیکن مجھ سے ذرا فاصلے پر چلو۔“

”کیوں؟“ وہ حیران ہو کر بولی۔

”بھی لوگ کیا کہیں گے، اتنا پینڈ سم بندہ اور ساتھ میں۔“

آگے گنٹایا۔

نالے لگتی تے نالے کالی۔

”کیا؟“ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ روٹھتے ہوئے بولی۔

”میں ابھی واپس چلی جاؤں گی۔“

”جاسکوگی واپس؟“ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”شاید نہیں۔“

”یقین سے کہو!“

”کبھی نہیں، کبھی نہیں۔“ ایک بار نظریں جھکا کر بولی۔

دوسری بار اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تو وہ اندر تک سرشار ہو کر مسکرایا اور چلتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆☆☆

پھر فوراً اصل موضوع کی طرف آتی ہوئی بولی۔

”تو ضیاء صاحب! میرا یہ کام جلد سے جلد ہو جانا چاہیے۔ میں آج ہی یہ گھر چھوڑ رہی ہوں۔ جی ہاں، میں کراچی جا رہی ہوں۔ میرا فون نمبر لکھ لیجئے۔ آئندہ مجھ سے اسی نمبر پر رابطہ کیجئے گا۔“ دوسری طرف وکیل صاحب کی بات سن کر ہنسی کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر بولی۔

”جی ہاں ضیاء صاحب! ہنسی میرے اس اقدام سے بہت خوش ہے، آپ تو جانتے ہیں وہ خاصا خدا ترس ہے۔ بیچارا چلنے سے معذور ہے، ورنہ آپ دیکھتے وہ غریبوں مسکینوں کے لیے کیا کچھ کرتا۔ اچھا خدا حافظ!“

وہ ریسوررکھ کر پوری طرح ہنسی کی طرف متوجہ ہوئی تو اسے اس کے ارادے خطرناک نظر آئے۔ وہ ہاتھوں میں راڈ لیے غالباً اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ پہلے پیچھے ہٹی، پھر بھاگ کر دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

”میں اگر چلنے سے معذور نہ ہوتا تو تم اس وقت زندہ یہاں سے نہیں نکل سکتی تھیں۔“ وہ غصے میں پاگل ہو کر راڈ اس کی طرف پھینکتے ہوئے بولا۔

”میں جانتی ہوں۔“ وہ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے اطمینان سے بولی۔ پھر باہر نکل کر دروازہ بند کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔

پھر چار بجے تک کا وقت اس نے بے حد مصروف گزارا۔ اس دوران اس نے جنید خان کی باقی اولادوں کو فون کر کے اپنا پروگرام بتایا اور جواب میں ان کی گالیاں سنیں۔ دوپہر ہونے تک فرحیہ کا ڈرائیور گاڑی لے کر آیا اور ہنسی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اور ہنڈ کو جاتے دیکھ کر اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے تھے۔

”کاش! ہنسی ایسا نہ ہوتا۔“ اس نے سوچا تھا۔

اور ٹھیک چار بجے وہ ایئر پورٹ پر موجود تھی۔ اس نے دیکھا، سرمد متلاشی نظروں سے یقیناً اسے ہی کھوج رہا تھا۔ وہ ایک دم اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

چاند سورج ہم سفر



”خدا کی قسم تم اسم بامسمیٰ ہو۔ آخر کیا سوچ کر تمہارے ماں باپ نے تمہارا نام سنجیدہ مانتھا۔ یقین کرو میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی پر اس کے نام کا اتنا گہرا اثر نہیں دیکھا جتنی تم اپنے نام کے زیر اثر ہو۔ کیا نام ہے..... سنجیدہ خانم!“

”ننانے آواز موٹی کر کے اس کے نام پر زور دیا۔ تب بھی وہ اسی طرح خاموشی سے دیکھ گئی۔ اس پر نندا مزید جھنجھلائی۔“

”اللہ کی بندی! کبھی کبھار ہنسنے کی زحمت کر لیا کرو۔ جڑے نہیں ٹوٹ جائیں گے ہمارے۔“

”کوئی ہنسنے کی بات ہو تو ہنسوں۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”چلو تو میں لطیفہ سنا دیتی ہوں۔“

”نہیں! رہنے دو۔“ وہ اکتا کر کہنے لگی کہ ننانے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”جا کہاں رہی ہو.....؟ میری بات کا جواب تو دو۔“

گئی۔

”تمہیں یہ اچانک شادی کی کیا سوجھی؟ کم از کم بی اے تو مکمل کرلو۔ یہی کوئی دو تین مہینے تو ہیں امتحانوں میں۔“

”کیا کروں؟ میں نے تو خود می سے یہی کہا تھا لیکن بیماری نے می کو وہی بنا دیا ہے۔ ہر وقت یہی کہتی ہیں۔ اپنی زندگی میں میری اور بھائی کی شادی کر دیں۔“

”تمہارے بھائی کی بھی شادی ہے؟“ اس نے یونہی پوچھ لیا۔

”می تو ایسا ہی چاہتی ہیں لیکن بھائی کا مسئلہ یہ ہے کہ انہیں کوئی لڑکی پسند نہیں آرہی۔“

پھر اپنے بارے میں بتانے لگی۔ ”چار سال پہلے میری منگنی میرے تایا زاد سے ہوئی تھی۔ اس وقت میرے ڈیڈی بھی حیات تھے۔ میرے تایا کی فیملی عرصہ دراز سے کینیڈا میں مقیم ہے۔ جب سے می بیمار رہنے لگی ہیں انہوں نے تایا جی کو لکھنا شروع کیا ہے کہ آکر اپنی امانت لے جائیں۔ عیسر چونکہ پڑھ رہا تھا اس لیے وہ لوگ فوراً نہیں آ سکے ورنہ دو سال پہلے ہی میں رخصت ہو جاتی اور اب کیونکہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر چکا ہے اس لیے تایا جی نے تاریخ لکھ بھیجی ہے۔ بہت مختصر مدت کے لیے آرہے ہیں وہ لوگ۔ بس شادی کریں گے اور تین چار روز بعد ہی واپسی۔“

”گویا مجھے اپنی واحد دوست سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے؟“ وہ افسردہ سی ہو

گئی۔

”جی ہاں! مجھے پتہ ہے میرے جاتے ہی نئی دوستیاں.....“

”نہیں ندا۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”میں کیونکہ دوستی کے تقاضے نہیں نبھا سکتی۔ اس لیے میں نے کبھی دوست نہیں بنائی۔“

”اصل میں میرے اندر تجسس پیدا ہو گیا تھا کہ تم اتنی الگ تھلگ سی کیوں رہتی ہو؟“

”بہر حال..... یہ تمہاری محبت ہے کہ مجھ جیسی بورلڑکی کے ساتھ تم نے چار سال انتہائی تحمل سے گزارے۔ اور پتہ ہے ندا! تم مجھے زندگی کے ہر موڑ پر بہت یاد آؤ گی۔ اور یہ جو کالج میں دو

”کون سی بات؟“ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”کمال ہے یار! اتنی اہم بات کو تم اہمیت نہیں دے رہیں۔ بھئی میری شادی ہے..... آؤ گی ناں؟“

”میں.....!“ اپنی طرف اشارہ کیے وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”کوئی عذر نہیں سنوں گی۔ سمجھیں تم.....!“

”عذر کی بات نہیں ہے۔ ندا تم تو جانتی ہو.....“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ ندا صاف مگر گئی۔

”کیوں..... کیا تم میرے ابا جی کو نہیں جانتیں؟ کتنے سخت ہیں۔ کہیں بھی جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ بس گھر سے کالج اور کالج سے گھر۔ اس سے ہٹ کر تو کبھی ہم نے سوچا ہی نہیں۔ یقین کرو ہماری ایک خالہ اسی شہر میں رہتی ہیں لیکن ہم کبھی ان کے گھر نہیں گئے۔ خاص طور پر ہم بہنیں، اماں کبھی سال میں ایک آدھ بار چلی جاتی ہیں۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”ان کے بیٹے کی شادی تھی۔ انہوں نے اتنی خوشامد کی ابا جی کی کہ گھڑی دو گھڑی کے لیے ہی بیٹیوں کو بھیج دیں لیکن ابا جی نہیں مانے۔ اب تم خود سوچو..... اپنے رشتہ داروں کے ہاں تو جانے نہیں دیتے تمہارے ہاں کیسے آنے دیں گے.....؟“

”آخر وہ ایسے کیوں ہیں؟“ ندا پوچھنے لگی۔

”پتہ نہیں.....! اماں بتاتی ہیں شروع سے ہی ایسے ہیں۔ پہلے اماں کے ساتھ بھی اتنی ہی سخت تھی۔ میکے تک نہیں جانے دیتے تھے۔ اب بھی زیادہ تو نہیں جانے دیتے بس وہی سال میں ایک آدھ بار۔ اور میں اور فہیدہ تو کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”تمہارا دم نہیں گھٹنا ایسے ماحول میں؟“

”نہیں.....! شاید ہم عادی ہو گئے ہیں۔“

”بہر حال تم کچھ بھی کہو۔ میری شادی میں تمہیں ضرور آنا ہے۔“ ندا پھر اپنی بات پر آؤ

”مشکل ہے۔“ وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اب چلو ایک پیر میڈ تو تم نے بس کر ہی دیا۔ باقی تو اینڈ کر لیں۔“

”چلو!“ ند ابادل غواستہ اٹھی۔ پھر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔

”ایک دور روز میں تمہارے گھر آؤں گی۔ اس کے بعد تو پھر شاید ہی کہیں نکلتا ہو۔“

”کالج کب تک آؤ گی؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”بس کل کا دن..... وہ بھی تمہاری خاطر۔“

”اور شادی کب ہے؟“

”کارڈ لے کر آؤں گی تو دیکھ لینا۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ ہلکے سے مسکرائی۔

☆☆☆

ند نے اُس سے کہا تھا کہ وہ ایک دور روز میں اس کے گھر آئے گی لیکن پورا ہفتہ گزر گیا تھا اور وہ نہیں آئی تھی۔ وہ یونہی ہر آہٹ پر چوکتی رہی۔ اصل میں اس کے اندر ایک انجانا سا خوف تھا۔ پتہ نہیں وہ اباجی سے کیسے بات کرے گی؟ اور اباجی کیا جواب دیں گے؟ کبھی سوچتی..... اچھا ہے نہ آئے اور کبھی اُس کے آنے کی دعا کرتی۔ بہر حال لاشعوری طور پر وہ اس کی منتظر ضرور تھی۔ جیسی ہر آہٹ پر چونک جاتی تھی اور چونکنے کے ساتھ اس کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ اور ایسا اباجی کی وجہ سے تھا۔

اباجی کو اس نے شروع ہی سے ڈکٹیٹر کے روپ میں دیکھا تھا۔ مزاج کی سختی نے لہجے کو تو سخت بنایا ہی تھا چہرہ بھی کھر در اور ہمہ وقت پیشانی پر لکیریں رہتی تھیں۔ اُسے نہیں یاد کہ وہ اپنی اب تک کی زندگی میں کبھی خود سے اُن کے پاس گئی ہو یا کوئی بات کی ہو۔ اپنی بات اُن تک پہنچانے کے لیے اُس نے ہمیشہ اماں کا سہارا لیا۔ اور اماں خود بھی اُن سے بہت ڈرتی تھیں۔ پتہ نہیں وہ ایسے کیوں تھے؟ وہ اکثر سوچتی اور زیادہ ملال اس بات کا ہوتا کہ اُن کی سخت گیر طبیعت کی

تین مہینے رہ گئے ہیں یہ تو بہت ہی مشکل گزریں گے۔ میں بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔“

”بے وقوف ہو تم!“ ندا اس کے افسردہ ہونے پر ٹوکنے لگی۔ ”اب کالج میں تو تمہارے اباجی تمہیں دیکھنے نہیں آتے۔ کم از کم یہاں تو تمہیں اپنے ماحول سے نکل جانا چاہیے تھا۔“

”میں ایسا کر سکتی تھی۔“ وہ طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”لیکن اس کے بعد یہ ہوتا کہ مجھے اپنا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا جیسے فہمیدہ گھر میں اکتائی اکتائی سی رہتی ہے۔“

”اب میں تمہارے لیے دعا ہی کر سکتی ہوں کہ اللہ کرے تمہاری جلدی کہیں شادی ہو جائے تاکہ تمہیں آزادی کا سانس نصیب ہو۔“

ند نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو وہ اس کے ہاتھ تھام کر بولی۔

”اپنی شادی ہو رہی ہے تو اب سب کے لیے یہی دعا کر دو گی.....!“

”بالکل!“ پھر اپنی پہلی بات پر آگئی۔ ”پھر آؤ گی ناں میری شادی میں؟“

”میرے بغیر تمہاری شادی نہیں ہو سکتی.....؟“

”نہیں۔“ ندا روٹھے لہجے میں بولی۔ ”اب دیکھو ناں! مجھ پر تو ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے تمہارے علاوہ اور کسی کو دوست نہیں بنایا۔ تمہیں کم از کم اتنا تو سوچنا چاہیے۔“

”میں کیا کروں؟“ وہ روہانسی ہو گئی۔ ”اگر میں اباجی سے اجازت لینے کی ہمت کر بھی لوں تو بھی مجھے پتہ ہے وہ صاف انکار کر دیں گے۔“

”تمہارے اباجی سے میں بات کروں گی۔“

”تم.....!“

”ہاں میں۔“ ندا کے حتمی انداز سے وہ ڈر گئی اور اسے بھی ڈرانے کی غرض سے بولی۔

”اباجی کسی کال یا ناظر نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے تمہیں ڈانٹ دیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں آرام سے اُن کی ڈانٹ سُن لوں گی لیکن انہیں منا کر ہی دم لوں

گی۔“

شاید وہ جانتی تھی کہ ایسی کوئی بات اسے ایک اچھی دوست سے محروم کر دے گی۔ اور اب جب ندا کی شادی ہو رہی تھی اور شادی کے فوراً بعد اُسے کینیڈا چلے جانا تھا تو وہ چاہتی تھی کہ سنجیدہ اس کی شادی میں ضرور آئے۔ ویسے بھی وہ اس کی واحد دوست تھی۔ اور چاہتی تو وہ بھی تھی کہ ندا کی خوشی میں ضرور شریک ہو لیکن مجبور تھی۔ اندر کہیں ہلکی سی آس بھی موجود تھی کہ شاید اباجی ندا کی بات مان لیں اور ندا تھی کہ دو دن کا کہہ کر اب تک نہیں آئی تھی۔

”سنو!“ فہمیدہ بہت دیر سے اُسے غم صُم دیکھ رہی تھی۔ اس کی طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔ ”ویسے تو تمہاری شکل ہے ہی پریشان سی..... لیکن ادھر کچھ دنوں سے زیادہ پریشان نظر آ رہی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر سیدھی ہو بیٹھی۔

”بھی! تمہیں کم از کم مجھ سے تو کوئی بات نہیں چھپانی چاہیے۔“ فہمیدہ اس سے چھوٹی

ہونے کے باوجود تنبیہی لہجے میں بولی۔

”میں کچھ نہیں چھپا رہی۔“

”پھر پریشان کیوں ہو؟“

”اصل میں ندا کی شادی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں ضرور اس کی شادی میں شرکت کروں۔“ اس نے بتایا۔ پھر کہنے لگی ”اب تم بتاؤ! کیا اباجی جانے دیں گے؟“

”مشکل ہے۔“ فہمیدہ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

”اور ندا کہہ رہی تھی وہ خود آ کر اباجی سے اجازت لے گی۔ میں سوچتی ہوں اگر اباجی نے اسے صاف منع کر دیا تو کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ حالانکہ میں نے اُسے اباجی کے بارے میں بتا رکھا ہے کہ اُن کا مزاج کیسا ہے۔ پھر بھی.....“

اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی کیونکہ سامنے سے ندا آ رہی تھی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”دیکھو! ندا آ بھی گئی۔“ فہمیدہ نے گردن موڑ کر دیکھا۔ پھر کھڑی ہو گئی اور ندا کے

بدولت گھر کا ماحول بہت گھٹھا ہوا تھا۔ کہیں آنا جانا نہیں۔ اگر آس پاس پڑوس سے کوئی خاتون آ جاتی تب بھی بعد میں وہ اماں پر بگڑتے ہوئے اس قسم کے جملے بولا کرتے تھے۔

”کوئی کام نہیں ہوتا ان نورتوں کو، بس دوسروں کے گھروں میں جھانکتی پھرتی ہیں۔“

شاید اسی لیے اماں نے کبھی کسی سے زیادہ راہ ورسم نہیں بڑھائی تھی اور خود اس نے بھی۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اُسے تو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی لیکن آس پڑوس سے اس کی ہم عمر لڑکیاں اس کے گھر آ جاتیں تو وہ اُن کے ہاتھ کھیلنے کی بجائے کن اکھیوں سے اباجی کو دیکھا کرتی تھی کہ کہیں وہ سب کے سامنے اُسے ڈانٹنے بیٹگیں۔ یوں کھیل سے اُس کی عدم توجہی یا عدم دلچسپی کی بنا پر لڑکیوں نے خود ہی اس کے گھر آنا چھوڑ دیا۔ پھر جب وہ اسکول جانے لگی تو شروع شروع میں اُسے گھر سے نکلنا اور پھر اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ باتیں کرنا بہت اچھا لگا۔ لیکن جب ایک روز ایک لڑکی نے اس سے کہا۔

”پہلے تم میرے گھر آ پھر میں تمہارے گھر آؤں گی۔“

تو اسی وقت سے وہ کچھ محتاط سی ہو گئی تھی۔ نام تو اس کا تھا ہی سنجیدہ..... اپنے اوپر بھی سنجیدگی کا ایسا خول چڑھایا کہ کلاس کی لڑکیاں بھی اس سے کترانے لگی تھیں۔

یہ صورت حال اُس کے لیے پریشان کن تو تھی لیکن وہ مطمئن بھی تھی کہ اب کوئی اسے اپنے گھر تو نہیں بلکائے گا اور نہ ہی اس کے گھر آنے کی بات ہوگی۔ انہی حالات میں وہ پروان چڑھی۔ اسکول کے بعد کالج میں بھی وہ ایسی ہی تھی۔ سب سے دُور دُور الگ تھلگ سی۔ اپنے آپ کو کتابوں میں غم رکھتی۔ اور ندا کو بہت نہیں اس کی کون سی اداس پنڈ آئی تھی کہ اس کے گریز کرنے کے باوجود زبردستی اس کے ساتھ لگی رہنا اور بالآخر اس سے دوستی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ وہ ندا پر کھلی چلی گئی۔ اور ندا کو اس سے کچھ ایسی اُنسیت سی ہو گئی تھی کہ محض اس کی خاطر اس نے کسی اور کی دوستی قبول نہیں کی۔ یہ چار سال دونوں نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ اس دوران ندا کبھی اُس کے گھر نہیں آئی تھی اور نہ کبھی اس نے اُسے بلایا تھا۔

”وہ دونوں اندر ہیں۔ آؤ چلو!“

”میرا خیال ہے تم یہیں ٹھہرو..... میں اُن سے بات کر آتی ہوں۔“

اس کا ڈراڈرا چہرہ دیکھ کر ندانے اُسے وہیں رکنے کا کہا اور خود اندر چلی گئی تو وہ فہمی کا ہاتھ پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔ دونوں بہنوں نے جیسے سانس تک روک لیا تھا اور اُن کا دھیان اندر کی طرف تھا جہاں سے ندا کا بس پہلا جملہ ہی سنائی دیا تھا۔

”میں ندا ہوں..... سنجیدہ کی دوست۔ اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی رہی ہوں۔“ اس کے بعد پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی! کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

”فہمی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ بہت آہستہ آواز میں بولی تو فہمی اُسے وہاں سے اٹھا کر کچن میں لے آئی اور اسٹول پر بٹھاتے ہوئے بولی۔

”تم تو بالکل پاگل ہو چکی! ایسی ڈرنے والی کون سی بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ اباجی منع کر دیں گے۔“

”ہاں! ہاں! ہاں! کی صورت آہٹکی اور اُس نے دیوار سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر جیسے اپنے آپ سے بولی۔

”گزشتہ چار سالوں میں ندا اور میں کبھی ایک دوسرے سے نہیں روٹھے۔ اور یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ اب جب ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں تو ندا خفا ہو گئی۔“

”وہ تم سے کیوں خفا ہو گئی؟“

”تم دونوں یہاں ہو؟“ ندا کچن کے دروازے میں سے جھانک کر بولی تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ پل میں وہ مجسم سوالیہ نشان بن گئی تھی۔

”عجیب لڑکی ہو تم.....! ہمیشہ مجھے اپنے اباجی سے ڈراتی رہیں۔“ ندا اُس کے دیکھنے پر شروع ہو گئی۔ ”جبکہ وہ تو اتنے اچھے ہیں۔ کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ بڑے آرام سے اجازت دے دی۔“

قریب آنے پر کہنے لگی۔

”آپ ہیں ندا.....!“

”تم یقیناً فہمی ہو۔“ ندا مسکرا کر بولی۔

”جی! آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ غائبانہ تعارف تو پرانا ہے بلکہ ابھی بھی ہم آپ ہی کی باتیں کر رہے تھے۔“

”جی میری برائیاں کر رہی ہوگی۔“ ندا اُسے دیکھ کر شرارت سے بولی۔

”تعریفیں ہی تعریفیں..... یقین کر لیں۔“

”یقین کر لیا۔ اب جلدی سے بتاؤ تمہارے اباجی کہاں ہیں؟“ وہ یوں ادھر ادھر دیکھ کر

بولی۔ جیسے اباجی یہیں کہیں بیٹھے نظر آجائیں گے۔

”تم بیٹھو تو سہی۔“ وہ گری اس کے سامنے کھینچ کر بولی۔

”نہیں یار! میں بیٹھ نہیں سکتی۔“ ندا نے بیٹھنے سے انکار بھی کیا اور بیٹھ بھی گئی۔ پھر کہنے

لگی۔ ”اصل میں می کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اس لیے مجھے آنے میں دیر ہوئی۔ اب بھی بڑی مشکل سے آئی ہوں۔“

”تمہاری می کو ہوا کیا ہے؟“

”پتہ نہیں یار! جب سے ڈیڈی کی ڈھتھ ہوئی ہے تب سے ہی می بیمار رہتی ہیں۔ میرا تو

خیال ہے ڈاکٹر زان کا مرض تشخیص ہی نہیں کر پار ہے ورنہ جتنی باقاعدگی سے اُن کا علاج ہو رہا ہے اب تک تو ٹھیک ہو چکی ہوتیں۔ بہر حال شادی کے بعد بھائی جان انہیں باہر لے جا رہے ہیں۔“

”اللہ میاں انہیں اچھا کر دے۔“ اس نے تسلی کے بول بولے۔ پھر فہمی سے کہنے لگی۔

”جاؤ! تم چائے تو بناؤ۔“

”نہیں بھو! چائے رہنے دو۔“ ندا فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”مجھے بس جلدی سے اپنی اماں اور

اباجی سے ملو اور۔“

کی اجازت دی۔

”بچی کی سہیلی کی شادی ہے۔ بس وہی چلی جائے اور کسی کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اُن کی بات دو ٹوک ہوا کرتی تھی۔

اُس کے لیے یہی غنیمت تھا کہ اباجی نے اُسے منع نہیں کیا تھا لیکن اکیلے جاتے ہوئے وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ کچھ عجیب سا بھی لگ رہا تھا کیونکہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کہیں جا رہی تھی۔ گو کہ بہت سادگی سے تیار ہوئی تھی..... پھر بھی عام دنوں کی نسبت بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ہلکے بادامی رنگ کا سادہ سوٹ اس کی رنگت سے میچ کر رہا تھا۔ سیدھی مانگ کے ساتھ بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چوٹی آنکھوں میں فہمی نے زبردستی کا جل لگا دیا تھا جو پھیل کر کناروں تک چلا آیا تھا جس سے سیاہ آنکھوں کی خوبصورتی نمایاں ہو گئی تھی۔ ندانے گاڑی بھیج دی تھی جس سے جانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔

جس وقت وہ ندا کے گھر پہنچی اس وقت تک بہت کم مہمان آئے تھے۔ پھر ندانے اُسے بتایا کہ بس اتنے ہی لوگوں کو بلایا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی مہمی کی طبیعت کافی خراب تھی۔ ادھر اُس کے تایا جی بھی خاص طور سے بیٹے کی شادی کے لیے آچکے تھے۔ پھر خود می بھی یہی چاہتی تھیں کہ جلد سے جلد اُس کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں اور وہ کسی طرح بھی شادی ٹالنے کے حق میں نہیں تھیں بلکہ اُن کی یہ خواہش تھی کہ ندا کے ساتھ ساتھ بیٹے کے سر پر بھی اسی وقت سہرا سجا دیں۔ اور اُن کے بیٹے کو کوئی اعتراض تو نہیں تھا لیکن مسئلہ وہی لڑکی کا تھا۔ اب تک می نے اُسے جتنی لڑکیاں دکھائی تھیں..... وہ سب کو مسترد کر چکا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا چاہتا تھا یا اُس کی پسند کیا تھی؟ می بہر حال خاصی مایوس ہو گئی تھیں اور شاید یہ بھی سمجھنے لگی تھیں کہ وہ شادی ہی نہیں کرتا چاہتا۔

ندا کا نکاح ہوا..... وہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔ بہت خاموشی سے تمام کارروائی دیکھتی رہی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ندا کی ایک کزن بوکھلائی ہوئی آئی۔

”ندا پلیز! جلدی آؤ۔ آنٹی کی طبیعت بہت بگڑ رہی ہے۔“

”کیا.....؟“ اس کے ساتھ ساتھ فہمی کے ہونٹ بھی کھل گئے۔

”اور کیا..... اور اب تم ضرور آنا بلکہ سب آنا۔“

”اچھا تم بیٹھو تو سہی۔ پہلی بار آئی ہو اور کچھ نہیں تو ایک کپ چائے ہی پی لو۔“

”اگر می کی طرف سے پریشانی نہ ہوتی تو میں ضرور رکتی۔ بہر حال بشرط زندگی چائے پھر کبھی سہی۔“ ندا معذرت کرتے ہوئے بولی۔ اور ایک بار پھر اُن دونوں کو آنے کی تاکید کرتے ہوئے چلی گئی تو دونوں اباجی کے اجازت دینے کو معجزے سے محمول کرتے ہوئے تبصرہ کرنے لگیں۔

”کب سے دوستی ہے اس لڑکی سے.....؟“ رات میں جب اباجی عشاء کی نماز مجھے لیے چلے گئے تو اماں اُس سے پوچھنے لگیں۔

”چار سال سے۔“

”پہلے تو وہ کبھی یہاں نہیں آئی۔“ اماں نے کہا تو وہ شاکی نظروں سے دیکھنے لگی جبکہ فہمیدہ بول پڑی۔

”اور کون آتا ہے ہمارے ہاں جو آپ کو ندا کا پہلے نہ آنا کھل رہا ہے۔ اباجی کا رویہ ہی ایسا ہے کہ ہم نے کبھی اپنی کسی سہیلی کو گھر نہیں بلایا۔“

”میں تم سے تو بات نہیں کر رہی۔“ اماں کو فہمی کا بولنا ناگوار گزرا تو ٹوک دیا۔

”آپ بات ہی ایسی کمر رہی ہیں۔“

”اچھا! تم چپ رہو۔“

”لیجئے! چپ ہو گئی۔“ فہمی نے کہا ضرور لیکن منہ ہی منہ میں بوڑھائی رہی تھی۔

☆☆☆

ندانے سب کو بلایا تھا اور اس کے سامنے تو اباجی نے بھی ہامی بھری تھی لیکن جب اس کی شادی میں جانے کا وقت آیا تو اباجی جانے پر آمادہ ہی نہیں ہوئے اور نہ ہی اماں اور فہمی کو جانے

لکزن منت سے بولی۔

”میں کیا کروں؟“ ندا کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ وہ اخلاقا پوچھنے لگی۔

”مئی بھائی جان کی شادی دیکھنا چاہتی ہیں..... اس وقت۔“ ندا اچانک خاموش ہو گئی۔ نظریں اس پر جمائے پتہ نہیں کیا سوچنے لگی تھی۔

”تم کچھ کہہ رہی تھیں۔“ اس نے کہا تو ندا نے چونک کر سر جھٹکا۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کر

لی۔

”سُنی! تم میرے بھائی جان سے شادی کر لو۔“

”کیا.....؟“ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔

”پلیز سنی! یہ میری مئی کی آخری خواہش ہے۔ پتہ نہیں اس کے بعد مئی.....“

ندا ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی تو وہ پریشان ضرور ہوئی لیکن اُسے چپ کرانے کی دُش نہیں کی۔ اس کی کزن کہنے لگی۔

”دیکھیں..... عام حالات میں تو یہ یقیناً بہت احمقانہ سی بات ہوتی لیکن اس وقت سُنو یہ ہے کہ ہم فوری طور پر کوئی لڑکی نہیں ڈھونڈ سکتے اور آنٹی کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اس وقت نانی خواہش رد کی جاسکے۔“

”تو آپ بھی تو ہیں..... آپ کیوں نہیں.....؟“ وہ اسی قدر کہہ سکی۔

”میں شادی شدہ ہوں۔“ اس کے انکشاف پر اس نے بغور اُسے دیکھا۔ پھر نفی میں سر تے ہوئے بولی۔

”آئی ایم سوری! میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی۔ میرے والدین تو مجھے زندہ دفن کر

یا گئے۔“

”جی! میرے ساتھ اندر آؤ۔“ ندا ایک جھٹکے سے اٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتے

ندا اُسی حالت میں اُٹھ کر بھاگی تو وہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی لیکن جس کمرے میں وہ داخل ہوئی وہ اس کے دروازے پر ہی رُک گئی تھی۔ محض یہ سوچ کر کہ پتہ نہیں اندر کون کون ہوگا۔ پھر اُسے یوں دروازے پر کھڑے رہنا بھی اچھا نہیں لگا تو دوبارہ پہلے والے کمرے میں آگئی۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ بیڈ کے کنارے خاصے تکلف سے بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں ندا کی مئی کے ٹھیک ہونے کی دعا مانگنے لگی۔ گو کہ یہ شادی کا گھر تھا لیکن اچانک اس قدر سناٹا چھا گیا تھا کہ اُسے خُپہ ہونے لگا کہ جیسے وہ کسی غلط جگہ آگئی ہو۔

”میرے خدا.....! کوئی خوشی دے تو اس طرح نہیں کہ آس پاس غم کے بادل منڈلاتے ہوں۔“ اُس نے سوچا اور اُٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ندا آگئی۔

”کیسی ہیں آنٹی؟“ وہ فوراً پوچھنے لگی۔

”ڈاکٹر چیک کر رہا ہے۔“ ندا کی آواز بھڑائی ہوئی تھی اور وہ جلدی جلدی اپنے زیور اتار کر دراز میں رکھنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو الماری سے کپڑے نکال کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ وہاں سے واپس آئی تو اُس سے کہنے لگی۔

”تم بھی کیا سوچتی ہوگی کہ یہ کیسی شادی ہے.....“

”ارے نہیں!“ وہ بڑھ کر اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ”بس آنٹی اچھی ہو جائیں۔“

”ندا.....!“ ندا کی کزن اُسے پکارتی ہوئی آگئی۔

”اب بتاؤ کیا کریں۔ وہ نواب صاحب کہہ رہے ہیں جو بھی ہو جیسی بھی ہو مجھے منظور ہے۔ بس مئی کی یہ خواہش فوراً پوری ہونی چاہیے۔“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ ندا سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے باری باری دونوں کو دیکھنے لگی۔

”اس طرح مت بیٹھو ندا! پلیز کچھ کرو۔ اس وقت آنٹی کی ایک ہی خواہش ہے۔“ اس

بقریب لاکھڑا کیا اور اپنی می پر جھک کر بولی۔

”می! دیکھئے کون آیا ہے.....؟“ می نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ اسے آگے

رتے ہوئے بولی۔

”آپ بہودیکھنا چاہتی ہیں ناں! تو یہ دیکھئے بھائی جان کی پسند.....“

”ماشاء اللہ!“ می کمزور آواز میں بولیں اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے تو وہ بالکل

زارادی طور پر اُن کے پاس بیٹھ گئی اور اُن کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”آپ بہت جلد اچھی ہو جائیں گی۔“

”تم میرے پاس رہو گی تو ضرور اچھی ہو جاؤں گی۔“ می نے مسکرانے کی کوشش کی۔

رندا کو قریب بلا کر کہنے لگیں۔

”اپنے تایا جی کو بلاؤ۔ وہ ابھی تمہارے بھائی کے سر پر سہرا باندھیں گے۔“

”جی!“ رندا نے گھبرا کر اسے دیکھا اور وہ می کے ہاتھ چھوڑ کر فوراً کھڑی ہو گئی جبکہ می

بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

”میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس سے پہلے کہ سانسوں کا رشتہ ٹوٹ جائے اپنے

اجی سے کہو جلدی کریں۔ میں اپنے بیٹے کی خوشی دیکھ لوں۔“

”ایسی باتیں نہ کریں می! آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ پھر ہم دھوم دھام سے

ٹی جان کی شادی کریں گے۔“ رندا نے کہا تو می کی آنکھوں میں پانی جمع ہو کر کناروں سے بہنے

”پلیز می! آپ مت روئیں۔“

”تم میری بات مانو اور اپنے تایا جی اور تائی جی کو بلاؤ۔“ می نے اصرار سے کہا تو وہ جا

ناہیں لے آئی اور انہیں دیکھتے ہی می کہنے لگیں۔

”بھائی جی! میرے بیٹے کے سر پر سہرا سجادیں۔“

ہوئے اپنی می کے کمرے میں لے آئی۔ اور اُن کے نحیف و نزار وجود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”دیکھو! یہ ہیں میری می۔ بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو میں اپنی زندگی کو کھینچ رہی

ہیں۔ اگر تم میں حوصلہ ہے تو جاؤ اُن سے کہہ دو کہ اُن کی زندگی میں اُن کی یہ آرزو پوری ہونا ممکن

نہیں ہے۔“

”پلیز ندا!“ وہ رو پڑی۔ ”کسی اور سے کہو۔“

”کوئی اور یہاں ہوتا ہے ناں!“

”میں کیسے مان لوں.....؟ میرے حالات تم جانتی ہو۔ میں تو تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی

کہ پہلے جا کر میرے اجی سے بات کرو۔ کیا کہیں گے وہ کہ تمہاری شادی میں آئی اور اپنی شادی

کی بات کرنے لگی۔ نہیں ندا! زندگی میں پہلی بار ہی میں اُن کے اعتنا و کی دھجیاں اڑا دوں.....؟

نہیں۔“ وہ تاسف سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”ایک صورت ہے۔“ رندا کی کزن پتہ نہیں کب اُن کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

سوچ انداز میں بولی تو وہ دونوں اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”شادی برائے شادی۔“

”کیا مطلب؟“ رندا فوراً پوچھنے لگی تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”تم کسی کو بتانا مت کہ یہاں تمہاری شادی ہوئی ہے۔ ابھی تم آنٹی کی خاطر ہامی بھر

لو۔ پھر جس طرح خاموشی سے تمہارا نکاح ہوگا بعد میں جب حالات بہتر ہو جائیں گے تو اسی

خاموشی سے تمہیں طلاق نامہ بھی مل جائے گا۔ یقین کرو یہ بات ہم تینوں کے درمیان رہے گی۔“

”نکاح کی کیا ضرورت ہے۔ تم لوگ ایسے ہی مجھے آنٹی سے متعارف کرا دو۔ کچھ بھی

کہہ کر میرا مطلب ہے جس بات سے وہ مطمئن ہوں۔“

”ایسا کر دیکھتے ہیں۔“ رندا اس کی بات سے قائل ہو کر بولی۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ

ہے دیکھے جا رہا تھا۔ بس کسی کسی وقت اس کے ہونٹ ذرا سے متحرک ہوتے یوں جیسے اندر مچلتی کسی ہش کو سرزنش کر رہا ہو۔

”ندا! ذہن کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔“ تائی جی بھی اسی طرح رو رہی تھیں۔ ندا سے ہٹھا کر جلدی سے پانی لے آئی اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے بمشکل ایک دو دنٹ حلق سے اتارے۔ پھر اس کا ہاتھ پرے ہٹاتے ہوئے بولی۔

”کاش! ہمیشہ کی طرح اب بھی ابا جی مجھے تمہارے ہاں آنے کی اجازت نہ دیتے۔“
 ”بچی پلیز!“ ندا اس کے سامنے نیچے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ ”اس طرح پریشان مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تمہیں اندازہ نہیں ہے ندا۔ اگر میرے گھر میں کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو.....“
 ”فکر مت کرو! ہم وہ وقت آنے ہی نہیں دیں گے۔“ ندا اُسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔
 ”بس دُعا کرو می اچھی ہو جائیں۔ پھر ہم سب ٹھیک کر لیں گے۔ چلو اٹھو اب تم منہ دھو لو اور اب رونا نہیں۔“ وہ اُسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے اُنھ کو ہاتھ روم میں چلی۔ واپس آئی تو ندا کہنے لگی۔

”چلو! اب کھانا کھا لو۔“

”میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ اور ویسے بھی اب دیر ہو گئی ہے۔ مجھے چلنا چاہیے پلیز۔“
 ”ڈرائیور سے کہو مجھے چھوڑ آئے۔“ ندا کچھ دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔ پھر قریب آ کر اس کے ہتھام کر بولی۔

”تم خفا تو نہیں ہو؟“

نفی میں سر ہلاتے ہوئے پھر اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

”پلیز! اب مت رونا۔“ ندا منت سے بولی۔

”مجھے تمہارے رونے سے بہت دکھ ہو رہا ہے اور میں گلشی فیل کر رہی ہوں۔ یقین کرو

اُس نے بے حد خوفزدہ ہو کر ندا کو دیکھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہیں صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ پھر اُسے کچھ خبر نہیں ہوئی کہ کمرے کے اندر چانک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ تائی جی نے بڑا سا سرخ دوپٹہ اس کے اوپر یوں ڈال دیا کہ وہ اس میں چھپ گئی تھی۔ وقتی طور پر اسے یوں لگا جیسے وہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہو اور اب کسی کو نظر نہیں آئے گی۔ لیکن پھر اچانک اُسے کسی انہونی کا احساس ہوا۔ فوراً وہاں سے اُنھ کو جاننا چاہتی تھی کہ ندا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور سرگوشی میں بولی۔

”پلیز بچی میری خاطر.....!“ اس نے وحشت زدہ ہو کر اُسے دیکھا دوسری طرف کوئی کہہ رہا تھا۔

”تمہیں قبول ہے؟“

”ہو سکتا ہے تمہاری ایک ذرا سی ہاں میں میری می کے لیے نئی زندگی کی نوید ہو.....!“
 ندا کا منت بھرا انداز اور اس کی آنکھوں میں التجائیں چل رہی تھیں۔

وہ بے بس ہو گئی۔ ہونٹوں سے سسکی کی صورت ہاں نکلی۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ندا نے اس کا سراپے کندھے پر رکھ لیا۔ وہ خود بھی رو رہی تھی۔ اُسی وقت تائی جی اس کے بھائی کے سر پر سہرا سجا کر اُسے می کے پاس لے آئے۔ جسے دیکھتے ہی می تکیے کے سہارے ذرا سی اونچی ہو گئیں۔ اچانک اُن کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ بیٹے کی پیشانی چوم کر اُسے ڈھیروں دعا مانگیں دیں۔ پھر ندا کو اشارہ کیا تو وہ اسے اٹھا کر می کے پاس لے آئی۔ وہ اب سسکیوں سے رو رہی تھی۔ آنسو ایک تو اتر سے بہہ کر اس کا پورا چہرہ بھگور رہے تھے۔

”روتے نہیں بیٹا!“ می نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی کو ہونٹوں سے چھوا تو وہ بھیگی پلکیں اٹھا کر نہیں دیکھنے لگی۔ وہ مانند چراغ سحری نظر آئیں۔ تب اس کے آنسو جو پل بھر کو زکے تھے پھر بہہ نکلے۔ می پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھیں وہ کچھ نہیں سن پائی۔ بس روئے چلی جا رہی تھی اور اُسے یہ خبر نہیں ہوئی کہ می کے دوسرے طرف کھڑا ایک شخص چپ چاپ

پھر جب وہ باتھ روم سے نکلی تب بھی اس کا خیال تھا چپ چاپ بستر میں گھس جائے گی
نہی جیسے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

”کیسی رہی شادی.....؟“

”کس کی؟“ کیونکہ ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا اس لیے بلا ارادہ منہ سے نکل گیا۔

”کس کی سے کیا مطلب؟ جس کی شادی میں گئی تھیں اس کا احوال پوچھ رہی
ہ۔“ نہی نے کہا تو وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ٹوکتے ہوئے بولی۔

”زیادہ دھوم دھام نہیں تھی کیونکہ ندا کی ممی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اس لیے بس گنتی
چند لوگ ہی تھے اور بہت سادگی سے نکاح ہوا۔“

”کیا ندا کی رخصتی بھی ہو گئی ہے؟“ نہی پوچھنے لگی۔

”نہیں..... میرا خیال ہے تین چار روز بعد وہ رخصت ہو کر سیدھی کینڈا ہی جائے
گی۔“

”پھر تم اتنا کیوں رو کی ہو؟“

”کیا؟“ وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

”بھئی جب وہ رخصت ہی نہیں ہوئی تو پھر تم کیوں روئیں؟“

”وہ اپنے گھر سے رخصت نہیں ہوئی لیکن مجھ سے تو ہو گئی ناں! اب کہاں ہماری
فات ہوگی.....!“ وہ سوچ کر بولی۔

”یہ تو ہے۔“ نہی سر ہلانے لگی۔ پھر کچھ دیر بعد بولی۔ ”ویسے تمہاری دوست بہت
نی تھی۔ اگر اسی شہر میں رہتی تو شاید پھر کبھی ملاقات ہو جاتی لیکن اب تو وہ کینڈا جا رہی ہے۔“

”ہاں!“ وہ جو احتیاط سے اپنے کپڑے تہہ کر رہی تھی انہیں رکھنے الماری کی طرف بڑھ
نا۔ وہاں سے پلٹی تو پوچھنے لگی۔

”اماں کہاں ہیں؟“

”اماں کہاں ہیں؟“

جو کچھ اچانک ہوا اس کا گمان بھی نہیں تھا۔ بہر حال..... تم بالکل فکر مت کرو بلکہ یوں سمجھو کچھ ہوا ہی
نہیں۔ اور سو! اس واقعے کو سوچ سوچ کر پریشان مت ہوتی رہنا۔ میں کل ہی بھائی جان سے کہہ
کر.....“

تائی جی کے آنے سے ندا کی بات ادھوری رہ گئی۔ اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی جبکہ وہ
اپنا چادر اوڑھ کر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

”تم جارہی ہو؟“ تائی جی ندا سے بات کرتے کرتے اس سے پوچھنے لگیں۔

”جی!“

”چلو! میں ڈرائیور سے کہتی ہوں تمہیں چھوڑ آئے۔“ اس سے پہلے کہ تائی جی اس سے

مزید سوال جواب کرتیں ندا اسے لے کر باہر آ گئی۔

”سو ندا! میں زیادہ دن تک یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکوں گی۔“ وہ گاڑی میں بیٹھنے

سے پہلے بولی۔

”میں نے کہا ناں! بالکل فکر مت کرو۔“ ندا نے اُسے یقین دلایا کہ وہ کل ہی اُسے

بہت خاموشی اور رازداری سے اس مجبوری کے بندھن سے نجات دلادے گی۔

گھر میں داخل ہوئی تو اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی سے سامنا نہ ہو۔ اس لیے پہلے تو

کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے باتھ روم میں گھس گئی۔ اس بہانے کتنی دیر تک اپنی آنکھوں اور

چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی رہی۔ مسلسل روتے رہنے کی وجہ سے آنکھیں سرخ ہونے

کے ساتھ سوجی ہوئی بھی لگ رہی تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ اُسے دیکھتے ہی اماں اور نہی سوال پر سوال کرنے لگیں گی۔ اور اُسے یہی

ڈرتھا کہ کہیں کسی مقام پر اس کے منہ سے اپنے بارے میں کوئی بات نہ نکل جائے۔ اور وہ یہ بھی

جانتی تھی کہ ندا کے گھر میں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس کی خبر اگر اس گھر میں کسی کو ہو گئی تو بابا جی جج جج

کا گلا دبا دیں گے۔

تھی کیونکہ ندانے کہا تھا کہ وہ کالج میں اس کے پاس آئے گی اور ظاہر ہے وہ اس وقت تک چین سے نہیں رہ سکتی تھی جب تک اس مجبوری کے بندھن سے نجات حاصل نہ کر لے۔

اس نے چائے بنا کر وہیں بیٹھے بیٹھے ایک کے بعد دوسرا کپ پیا۔ جس سے اس کے اعصاب پر قدرے اچھا اثر پڑا۔ پھر ناشتہ بنارہی تھی کہ باقی سب بھی اٹھ گئے۔ اس نے پہلے اماں اور اباجی کے لیے ناشتہ بنا کر فہمی کے ہاتھ اندر بھیجا۔ پھر خود فہمی کے ساتھ وہیں کچن میں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی۔

”آج کالج سے چھٹی کر لو۔“ فہمی اُسے مجبور دیکھتے ہوئے بولی تو وہ چونک پڑی۔

”کیوں؟“

”مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

”نہیں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ فوراً بولی۔

”کوئی نہیں..... آنکھیں بھی اتنی سرخ ہو رہی ہیں۔“

”جاگنے کی وجہ سے.....“ وہ بے خیالی میں کہہ گئی۔ پھر فوراً احساس ہوا تو سنبھلتے ہوئے بولی۔

”اصل میں کل ندانے بہت رُلا یا۔ خود بھی روتی رہی تھی۔ ویسے تو میرا بھی آج کالج جانے کو دل نہیں چاہ رہا لیکن آج ایک اہم لیکچر ہے۔ اگر بس ہو گیا تو مشکل ہو جائے گی۔ پھر ندا کے علاوہ میری اور کوئی دوست بھی نہیں ہے جو یہ سوچ کر بیٹھ رہوں کہ اُس سے لے لوں گی۔“

دل میں چور ہو تو انسان یونہی دوسرے کو مطمئن کرنے کے لیے پوری تفصیل بیان کر ڈالتا ہے۔ اس نے غلت سے پوری چائے حلق سے اُتاری اور فہمی کے مزید کچھ کہنے سے پہلے کچن سے نکل آئی۔

پھر وہ نہ صرف اس دن بلکہ ہر دن کالج کے اُسی گوشے میں جہاں وہ فری پیریڈ میں ندا کے ساتھ بیٹھتی تھی وہیں بیٹھ کر ندا کا انتظار کرتی رہی۔ اور ندا پہ نہ نہیں بھول گئی تھی یا کیا تھا کہ اتنے

”ابا کے لیے جو شانہ بنارہی ہیں۔“

”کیا ہوا ہے اباجی کو؟“

”بس ذرا گلے میں خراش ہے اور کچھ نہیں۔“ فہمی اُٹھتے ہوئے بولی۔ ”تم تو کھانا کھا کر آئی ہو گی؟“

”ہاں!“ اس نے جھوٹ بولا۔ ویسے بھی اس وقت کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بس یونہی فہمی کے پیچھے کچن تک آئی۔ کھڑے کھڑے اماں سے دو چار باتیں کیں۔ پھر نیند کا بہانا کر کے اپنے بستر پر آ گئی۔

وہ رات اس پر بہت بھاری تھی۔ ایک پل کے لیے سو نہیں سکی۔ زندگی میں کبھی بڑا حادثہ رونما ہو جائے گا۔ یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ حقیقتاً وہ اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اس قدر راجا تک اور اتنی جلدی جلدی میں سب کچھ ہوا کہ وہ پریشان تو تھی ہی۔ اب اُسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ کس طرح اجنبی لوگوں کے درمیان اتنی مجبور ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ندا کی مٹی کا نحیف و نزار وجود آسایا جن کی آنکھوں کی بچھتی ہوئی شمعیں اُس وقت روشن ہونے لگی تھیں۔ جس وقت انہوں نے اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجا دیکھا تھا۔

”ہو سکتا ہے تمہاری ایک ذرا سی ہاں میں میری مٹی کے لیے نئی زندگی کی نوید ہو.....!“

ندا کا منت بھرا لہجہ یاد آیا تو اس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔ اور وہ بڑے خلوص سے اس کی مٹی کی صحت و زندگی کے لیے دعا کرنے لگی۔

☆☆☆

پوری رات اس نے آنکھوں میں کائی تھی۔ کبھی بے شمار اندیشوں میں گھرتی اور کبھی اپنے آپ کو حوصلہ دیتی رہی تھی۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی اُس نے بستر چھوڑ دیا۔ پہلے وضو کر کے نماز پڑھی۔ پھر کچن میں آ گئی۔ رات بھر جاگنے اور پریشان سوچوں کی وجہ سے سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور اب دل چاہ رہا تھا چپ چاپ جا کر سو جائے۔ لیکن اس صبح کے انتظار میں ہی تو وہ جاگتی رہی

”نہیں..... کیوں؟“ اماں تعجب سے اُسے دیکھنے لگیں۔

”ابھی پوسٹ میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ میں سمجھی شاید مل وغیرہ ڈال گیا ہوگا۔“ پھر

اٹھتے ہوئے بولی۔ ”کھانا تیار ہے؟“

”ہاں! بس روٹی ڈالنی باقی ہے۔ کب سے فہمی سے کہہ رہی ہوں روٹی ڈال دے لیکن

وہ رسالے میں ایسی لگن ہے..... جب تک ختم نہیں کرے گی اُٹھے گی نہیں۔“

”میں کپڑے بدل لوں پھر ڈال دیتی ہوں۔“

”تم کیوں ڈالو گی۔ پہلے ہی تھکی ہوئی آئی ہو۔ اور ہاں پرچہ کیسا ہوا؟“

”اچھا ہو گیا ہے۔“ اس کا سارا دھیان بیگ میں موجود لفافے کی طرف تھا۔ سرسری

انداز میں جواب دے کر اندر چلی گئی۔ فہمی کو روٹی ڈالنے کے لیے کہا اور کپڑے لے کر بیگ سمیت

باتھ روم میں گھس گئی۔ بڑی عجلت میں لفافہ نکال کر کھولا اور سب سے پہلے بھیجنے والے کا نام دیکھا۔

نداکا خط تھا اور اُس نے لکھا تھا۔

”بچی! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ تمہاری کیفیت کا میں بخوبی اندازہ کر سکتی ہوں

اور یقین کرو..... اس تمام عرصے میں میں مسلسل تمہارے بارے میں سوچتی رہی ہوں اور میں تم

سے کم پریشان نہیں ہوں۔ اصل میں حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ میں وعدے کے باوجود تم سے

فوری رابطہ نہ کر سکی۔ تم نے اُن حالات میں جس طرح ہماری مدد کر کے میری کمی کو چند لمحوں کی جو

خوشی بخشی تھی وہ تمہارا مجھ پر ایک احسان ہے جو میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتی۔

میں تمہیں بتاؤں بچی.....! کہ میری کمی شاید وہی خوشی دیکھنے کے لیے زندہ تھیں۔ اُسی

رات وہ ہم دونوں بہن بھائی کی طرف سے مطمئن ہو کر دُنیا سے نانا توڑ گئیں۔ میری اُس وقت کی

کیفیت کو تم سمجھ سکتی ہو۔ کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ اور اسی حالت میں ممی کے سوئم کے بعد ہی

نایاجی وغیرہ مجھے اپنے ساتھ کینڈا لے آئے تھے۔

یہاں آ کر بھی میں بہت دنوں تک سنبھل نہیں پائی تھی۔ پھر تم تو جانتی ہو وقت بڑا مہم

وعدے کرنے کے باوجود نہیں آئی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر نندا اُس کے ساتھ یہ کیسا مذاق کر گئی ہے کہ اُس کی

جان پر بن گئی ہے۔ کاش اُس کے اختیار میں ہوتا تو وہ خود جا کر اُس سے پوچھتی

اور ستم تو یہ تھا کہ اگر اپنے اندر ہمت پیدا کر بھی لیتی تو نندا کے گھر کا ہی معلوم نہیں تھا۔

اُس کی شادی میں گئی ضرور تھی لیکن کیونکہ اُس کا ڈرامہ پور لینے آیا تھا اور وہ بھی پہلی بار کسی کے گھر جا

رہی تھی۔ اس لیے راستوں سے بالکل نا آشنا تھی اور اُس نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کیونکہ

جانتی تھی کہ اس کے بعد وہ پھر کبھی اس طرف نہیں آئے گی۔

بہر حال نندا کی لاپرواہی نے اُسے دکھ دینے کے ساتھ عجیب مشکل میں ڈال دیا تھا کہ

وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے

لیے کتنی مشکلات کھڑی ہو سکتی ہیں۔ اور انہی مشکلات کو سوچ سوچ کر وہ نہ صرف پریشان بلکہ

خونزورہ بھی تھی۔ پھر اماں اور ابا کی عزت کا خیال بھی تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا

کرے۔

انہی دنوں امتحان سر پر آگئے اور کالج سے بھی نانا ٹوٹ گیا۔ یہ چند دن جو امتحانوں کی

تیاری کے تھے وہ سب پریشانی میں گزر گئے۔ کتاب کھول کر ضرور بیٹھتی لیکن ذہن مسلسل ”اب کیا

ہوگا.....؟“ میں الجھا رہا تھا۔

اُس روز وہ پہلا پیپر دے کر آ رہی تھی کہ دروازے پر پوسٹ مین نے اُسے ایک لفافہ

دیا۔ اس نے دیکھا لفافے پر اُسی کا نام تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ فوراً لفافہ بیگ

میں ڈالا اور اس اتفاق سے دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے اندر آئی۔ اماں برآمدے ہی میں

بیٹھی تھیں۔ وہ محض یہ جاننے کے لیے کہ کہیں انہوں نے پوسٹ مین کی آواز تو نہیں سُن لی اُن کے

پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

”بجلی کا بل وغیرہ تو نہیں آیا؟“

دوں۔“

”بالکل پڑھو، کس نے منع کیا ہے؟ تمہاری غلطی ہے کہ میٹرک کے بعد ہی گھر بیٹھ

رہیں۔“

”کیا کروں.....؟ پڑھنے میں دل نہیں لگتا۔“ فہمی صاف گوئی سے بولی۔

”رسالے تو بڑے شوق سے پڑھتی ہو۔“

”وہ تو رسالے ہوتے ہیں..... مزے مزے کی کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔“

”کسی دن اباجی نے دیکھ لیا ناں تو ساری مزے مزے کی کہانیاں بھلا دیں گے۔“

”اباجی کی کیا بات کرتی ہو.....! اُن کا بس چلے تو ہماری سانسوں پر بھی پابندی لگا

دیں۔“

”کیا اُلٹی سیدھی ہانک رہی ہو.....؟“ اماں نے ٹوکا۔

”غلط نہیں کہہ رہی۔ ہر وقت ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ کون آیا..... کون گیا؟“

”جی وہاں کیوں کھڑی ہے تو فہمی یہاں کیوں بیٹھی ہے؟“

اور جس دن سے جی ندا کی شادی سے ہو کر آئی ہے، انہیں مسلسل یہ فکر ہے کہ کچھ بدلی

بدلی سی لگتی ہے۔“

”کیا؟“ اس کا چونکنا لازمی تھا۔ پوری آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگی اور وہ اسی روانی

سے بولی۔

”اور کیا تمہیں نہیں پتہ۔ ہر وقت تو اماں سے کہتے ہیں کہ جی سے پوچھو وہاں

شادی میں ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ وہ چپ چپ سی رہنے لگی ہے۔“

”اماں!“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ”اباجی ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟“

”اس کا تو دماغ خراب ہے۔“ اماں فہمی پر بگڑتے ہوئے کہنے لگیں۔

”انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ اور اگر وہ تم دونوں کی فکر کرتے ہیں تو اس میں کیا

ہے۔ رفتہ رفتہ سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ میں اگر بھولی نہیں تو کافی حد تک سنبھل ضرور رہنی اور یقین کرو سب سے پہلے مجھے تمہارا خیال آیا۔“

تمہاری پریشانی کا سوچ کر میں جس طرح کڑھتی ہوں..... اس کا شاید تم اندازہ نہ کر سکو۔ تم اب تک یقیناً مجھ سے خاصی متنفر ہو چکی ہو گی اور سوچتی ہو گی کہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکہ کیا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے جی! اب جب میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی ہوں تو دیکھو سب سے پہلے تمہیں ہی لکھ رہی ہوں۔

میں نے بھائی جان کو بھی پوری تفصیل لکھ دی ہے۔ تم بس اتنا کرنا کہ کسی دن بھائی جان کو فون کر دینا۔ اس کے بعد وہ خود ہی سب ٹھیک کر لیں گے۔

اور کیا میں اُمید رکھوں کہ تمہاری ناراضگی ختم ہو چکی ہو گی۔ پلیز جی! میں نے انجانے میں تمہیں جوازیت دی ہے اس کے لیے مجھے معاف کر دو۔“

تمہاری ندا

”ندا!“ اس کی پلکوں سے آنسو موتیوں کی صورت ٹوٹ ٹوٹ کر خط پر گر گئے۔

”میں واقعی تم سے بہت متنفر ہو چکی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہاری مہمی.....“

”سنجیدہ!“ اماں آواز دے رہی تھیں۔

اُس نے جلدی سے خط تہہ کر کے دوبارہ بیگ میں رکھا۔ پھر کپڑے بدلے اور منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی۔ اماں تخت پر دسترخوان بچھا رہی تھیں۔ اس نے کچن میں آ کر ڈونگے میں سالن نکالا اور پلیٹیں لے کر تخت پر آ بیٹھی۔ فہمی روٹی لے کر آگئی تو تینوں کھانے میں مصروف ہو گئیں۔

”جی! تمہارا پیر کیسا ہوا ہے؟“ فہمی کو بڑی دیر بعد خیال آیا۔

”جی!“ وہ اپنی سوچوں میں مگن تھی۔ بس اُس کی آواز سن سکی۔ اس لیے کچھ چونک کر

سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور فہمی اپنا سوال دہرانے کے بجائے کہنے لگی۔

”ایمان سے تمہیں دیکھ کر میرا بھی دل چاہنے لگا ہے کہ پھر سے پڑھنا شروع کر

”شام کو۔“ دوسرے طرف سے اطمینان سے جواب ملا۔
 ”سنو! اُن سے کہنا کہ ندا کی سہیلی کا فون آیا تھا اور میں دو دن بعد اسی وقت فون کروں گی۔ وہ گھر پر ہیں۔ سمجھ گئے ناں؟“
 ”جی۔“

اس نے ریسوررکھ کر گہری سانس لی۔ پھر پیسے ادا کر کے باہر نکلی تو اپنی پسینے سے تر ہتھیلیوں کو چادر کے پلو سے رگڑتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔
 اگر اُسے کالج کے علاوہ کسی دوست وغیرہ کے گھر جانے کی اجازت ہوتی تو وہ اسی بہانے شام میں نکل کر فون کر سکتی تھی لیکن یہی تو مشکل تھی اور اس کا اگلا پیپر دو دن بعد تھا۔ اس لیے اس نے دو دن بعد فون کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔

”پتہ نہیں ابھی کتنے مراحل طے کرنا باقی ہیں؟“
 اگلے دو دن اس نے اسی سوچ میں گزارے۔ اور مسلسل دعا کرتی رہی تھی کہ بغیر کسی پریشانی اور تردد کے سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے لیکن شاید اُس کے نصیب میں آسانیاں تھیں ہی نہیں کہ اگلی بار جب اس نے فون کیا تو دوسری طرف ندا کے بھائی جیسے منتظر تھے۔ اس کی آواز سنتے ہی کہنے لگے۔

”آپ سنجیدہ ہیں ناں! سنجیدہ خانم۔“
 ”جی!“ ایک اجنبی کے منہ سے اپنا نام بڑا عجیب سا لگا اور خاصا ناگوار بھی۔
 ”کیسے کیسے مزاج ہیں؟“ یوں بے تکلفی سے پوچھا گیا جیسے مدتوں سے شناسائی ہو۔
 ”میرے خدا!“ وہ بُری طرح شیشائی اور فوری طور پر کچھ کہہ بھی نہیں سکی۔ گو کہ اپنے طور پر وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی سے بات کرنے کے لیے اچھی طرح تیار کر چکی تھی۔
 ”ہیلو سنجیدہ!“ پہلے اُسے متوجہ کیا پھر کہا۔
 ”بھئی میں تو صبح سے آپ کے فون کا انتظار کر رہا تھا اور آپ ہیں کہ بات ہی نہیں کر

بُرا ہے۔ زمانے کے چال چلن دیکھ رہے ہیں۔ ایسے میں کیا اُن کا فرض نہیں بنتا کہ تم دونوں کا خیال رکھیں۔“

”اس کو خیال رکھنا کہتے ہیں.....؟“ فہمی دل کی بجز اس نکالنے کے موڈ میں تھی لیکن اماں نے اس بُری طرح ڈانٹا کہ بے چاری منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی اور وہ بہت خاموشی سے وہاں سے اُٹھ آئی۔

وہ اباجی سے بہت ڈرتی تھی۔ اب جو فہمی نے ایسی بات کہی تو اندر ہی اندر اس کا دل لرز کر رہ گیا تھا۔ اگر اباجی کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو وہ پتہ نہیں کیا کر ڈالیں گے.....!
 یہی سوچ کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی۔ ندا کے خط سے بھی کچھ ڈھارس بندھی تھی اور اگلے ہی روز جب وہ پیپر دے کر نکلی تو قریبی پی سی او سے ندا کے گھر فون کر ڈالا۔ دوسرے طرف ریسوررکھ کا کسی ملازم نے اُٹھایا تھا۔ اس کی آواز سن کر پوچھ رہا تھا۔

”آپ کون ہیں بی بی؟“
 ”میں ندا کی دوست ہوں۔“ وہ بمشکل اپنی آواز کو نارمل رکھ پائی جبکہ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

”ندا بی بی تو یہاں نہیں ہیں۔ وہ تو.....“
 ”مجھے معلوم ہے۔“ وہ اس کی پوری بات سنے بغیر بولی۔
 ”پھر آپ کس سے بات کریں گی۔“
 ”میں!“ وہ ندا کے بھائی جان کا نام سوچنے لگی لیکن اس کی یادداشت میں کہیں کوئی نام نہیں تھا۔ تب زچ ہو کر بولی۔

”ندا کے بھائی جان کو بلاؤ۔“
 ”وہ تو جی اس وقت آفس میں ہوتے ہیں۔“
 ”کس وقت آتے ہیں؟“ اس نے عجلت میں پوچھا۔

رہیں۔“

”مجھے ندانے خط میں لکھا ہے کہ میں آپ کو فون کر لوں۔“ وہ بمشکل بول پائی۔

”اچھا!“

وہ اچھا کہہ کر خاموش ہو گیا اور کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اُسے کہنا پڑا۔

”ندانے آپ کو بھی تو خط لکھا ہے ناں؟“

”ہاں! مجھے اس کا خط ملا ہے۔“

”پھر آپ کیا کر رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کچھ کریں ناں!“ وہ جلدی سے بولی۔

”کیا کروں؟“

وہ شاید اُسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا یا پھر اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا جبکہ وہ اندر

ہی اندر سلگنے لگی۔

”دیکھیں! ایک تو آپ خواہ مخواہ انجان بن رہے ہیں۔ دوسرے بات کو بھی بڑھا رہے

ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے میں کس قدر مشکل میں ہوں۔“

”آپ تو خفا ہونے لگیں۔“ وہ اس کے لہجے کی تیزی محسوس کر کے کہنے لگا۔

”میں انجان نہیں ہوں۔ ندانے مجھے ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”اس مسئلے کا ایک یہی حل تو نہیں ہے کہ جس خاموشی سے ہم ایک بندھن میں بندھے

تھے..... اسی خاموشی سے اسے ختم بھی کر دیں۔ اگر آپ سوچیں تو اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اس کے آس پاس جیسے سناٹوں کا راج ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس نے

سانس بھی روک لی۔

”میرا مطلب ہے اس بندھن کو خاموشی سے توڑنے کی بجائے علی الاعلان مضبوط بھی

تو کیا جاسکتا ہے۔“

”پلیز ایسی باتیں مت کریں۔“ وہ روڑے نہ کو ہو گئی۔

”میں کچھ غلط نہیں کہہ رہا بنجیدہ! آپ خود سوچیں..... یہ راستہ زیادہ آسان ہے۔“

”نہیں۔“

”کیا نہیں..... کیا آپ کسی اور کو پسند کرتی ہیں؟“

”نہیں!“

”پھر آپ کو اعتراض کیوں ہے؟ آخر کہیں نہ کہیں تو آپ کی شادی ہونی ہے۔“

”یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میرا خیال ہے یہ میرا ہی مسئلہ ہے۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا تو لمحہ بھر کو وہ ششدر رہ گئی۔ پھر ہوش آیا تو

بڈل پر ہاتھ مار کر کتنی بار ہیلو ہیلو کہا لیکن دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔

تب اپنی بے بسی پر آنکھیں بے اختیار چھٹک پڑیں۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں ریسور

اور پوچھل قدمیوں سے باہر نکل آئی۔

اس صورت حال نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ اس کی بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا

رہا اب وہ کیا کرے۔ جتنا سوچتی اتنا الجھتی جا رہی تھی۔ ایک بار تو اس نے اس نہج پر بھی سوچنا

کہ اس بندھن کو توڑنے کی بجائے مضبوط کر لینا چاہیے اور یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا کہ ندا

بھائی پر پوزل بھیجتے جو ہو سکتا ہے منظور کر لیا جاتا لیکن پھر اُسے فہمی کی بات یاد آئی۔

کچھ دن پہلے ہی تو وہ کہہ رہی تھی کہ اباجی کا کہنا ہے کہ وہ جب سے ندا کی شادی سے آئی

بدلی بدلی ہی لگتی ہے۔ اور اس بات نے اُسے مزید اس نہج پر سوچنے نہیں دیا۔ بلکہ اب تو یہ خوف

ادامن گیر ہو گیا کہ اگر ندا کے بھائی نے خود سے ایسی کوئی کوشش کی تو اباجی اُسے تو صاف منع

یہ گئے ہی..... بعد میں اُسے بھی نہیں چھوڑیں گے۔ ایک طرح سے اُن کے شے کو یقین جو مل

ئے گا۔ حالانکہ اس سارے قصے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو ندا کی مئی کی اہتر حالت دیکھ کر

بھی ہامی نہیں بھر رہی تھی۔ پتہ نہیں کیسے مجبور کر دی گئی۔ اور ندا خود تو پیادیس سدھار گئی۔ باری پریشانیوں اس کے لیے چھوڑ گئی تھی۔

اُسے پھر ندا پر غصہ آنے لگا۔ اور اُسی وقت اس نے اُسے خط لکھ کر اس نئی صورت حال سے آگاہ کرنے کے ساتھ لکھا کہ وہ اپنے بھائی کو منع کرے کہ اس کے ساتھ ایسا کوئی مذاق نہ کرے۔ وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

صبح جب اماں سبزی وغیرہ لانے کے لیے جانے لگیں تو اس نے وہ خط انہیں پوسٹ کرنے کے لیے دے دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس خط کا جواب آنے میں پندرہ بیس روز ضرور لگ جائیں گے اور اس دوران وہ بس ایک دو بار ہی اس کے بھائی کو فون کر سکتی تھی۔ پھر ظاہر ہے اس کے پیپر ختم ہو جاتے اور وہ گھر کی ہو کر رہ جاتی۔ پھر آخری بار جب وہ اُسے فون کر رہی تھی تو خاصی دلبرداشتہ تھی۔

”آخر آپ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں؟“

”میں تنگ نہیں کر رہا سنجیدہ خانم! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ وہ خاصی سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔

”شادی کوئی گڈے گڈی کا کھیل نہیں ہے۔ ایک بار ہو گئی سو ہو گئی۔“

”میں اس شادی کو نہیں مانتی۔“ وہ بے حد تلخی سے بولی۔

”آپ کے نہ ماننے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔“

”آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”بس یہ بتادیں! بارات لے کر کب آؤں؟“

”شٹ اپ!.....“ وہ آپے سے باہر ہو گئی

لیکن پھر فوراً احساس ہوا کہ اس طرح معاملہ بجائے سلجھنے کے مزید بگڑ جائے گا۔ تب

سنجھتے ہوئے بولی۔

”دیکھیں! یہ قطعی ناممکن ہے۔“

”میرے نزدیک یہ ناممکن نہیں ہے۔ کیسے تو ابھی ممکن بنا دوں؟“

”نہیں!“

”آخر آپ ایسا کیوں نہیں چاہتیں؟“ اس نے اصرار سے پوچھا اور وہ اسے اپنے

پلو حالات کیسے بتا دیتی۔ بس ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

”میرا خیال ہے آپ خوفزدہ ہیں۔“ وہ خود ہی کہنے لگا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ بھیسے لہجے میں بولی۔

”آپ بس وہی کریں جو ندا نے مجھ سے کہا تھا۔“

”ندا بے وقوف ہے۔“

”سب سے بڑی بے وقوف اور احمق تو میں ہوں۔“ بالآخر اس کا ضبط جواب دے گیا

و پھٹ پڑی۔

”ایک لپ گور عورت پر رحم کھاتے ہوئے اس کی آخری آرزو پوری کرنے کی خاطر جیسے شخص کے لیے ہامی بھری۔ جسے ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ میں کس مشکل میں گرفتار

ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ کے لیے یہ کوئی بات نہ ہو لیکن میں جس طبقے اور ماحول کی پروردہ ہوں۔

میرے مجبوری نہیں..... سراسر لغزش قرار دی جائے گی اور اس لغزش کی سزا آپ جانتے ہیں؟“ اس

دواز بھرا گئی تھی۔ اس لیے خاموش ہو گئی۔

”سنجیدہ!“ اس نے اندیشوں میں گھر کر پکارا۔

”مت نام لیں میرا۔“

”میں ہرگز آپ کو اپنا نام لینے کی اجازت نہیں دوں گی۔“

”چلئے۔ میں آپ کا نام نہیں لیتا لیکن آپ سہولت سے میری بات سن لیں۔“ وہ

الحان انداز میں بولا۔

”فکر تو انہیں بہت دنوں سے تھی۔“ فہمی اپنی معلومات کا رعب جھاتے ہوئے بولی۔
 ”بس تمہارے شوق کی وجہ سے اباجی خاموش تھے کہ تم بی اے کر لو۔۔۔۔۔ پھر سوچیں گے۔ اب اسے
 اتفاق کہہ لو یا تمہاری قسمت کی خوبی کہ جیسے ہی تم نے بی اے کیا۔۔۔۔۔ اچھا رشتہ آگیا۔“
 ”لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔
 ”کیوں؟“ فہمی کے انداز میں شوخی تھی۔ ہونٹوں پر دبی دبی شریہ مسکراہٹ۔
 ”پہلے میں ایم بی اے کروں گی۔“ وہ یہی عذر سوچ سکی۔

”اباجی سے پوچھا ہے؟ چچا ماموں کے گھر تو جانے نہیں دیتے کہ ان کے جوان جہان
 لڑکے ہیں۔ یونیورسٹی جانے دیں گے؟ کبھی خواب میں بھی مت سوچنا۔“
 ”میں یونیورسٹی جانے کو کب کہہ رہی ہوں؟ پرائیویٹ کر لوں گی۔“
 ”شادی کے بعد کر لینا۔“ فہمی نے لا پرواہی سے مشورہ دیا تو وہ اس کے ہاتھ تھام کر
 منت سے بولی۔

”سُناؤ! تم کسی طرح اماں کو راضی کر لو۔ پھر وہ خود ہی اباجی سے بات کر لیں گی۔“
 ”کیسی باتیں کرتی ہو؟“ فہمی اب کچھ ٹھٹھک کر اُسے دیکھنے لگی۔

”اماں تو تمہارے بی اے کرنے کے بھی خلاف تھیں۔ وہ بھلا مانیں گی۔“
 ”چلو! میں ایم بی اے نہیں کرتی لیکن شادی۔۔۔۔۔“ وہ آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگی۔
 ”سب ہی کی شادی ہوتی ہے۔ تمہاری کوئی دنیا میں زالی تو نہیں ہوگی۔ ویسے بھی میں
 نے ابتمام احمد کو دیکھا ہے۔ بہت اچھے ہیں اور میں تو اسی دن سے دعا کر رہی ہوں کہ اللہ کرے
 یہیں تمہاری بات چکی ہو جائے۔“

”کیا؟“ وہ اندر ہی اندر سہم کر بولی۔ ”تم نے کہاں دیکھا ہے انہیں؟“
 ”اس روز آئے تو تھے۔“ فہمی نے پہلے سرسری انداز میں بتایا۔ پھر اچنبھے سے کہنے لگی۔
 ”جی! رہتی تو تم بھی اسی گھر میں ہو۔ پھر تمہیں ان باتوں کی خبر کیوں نہیں ہوتی۔ تمہیں

”میں صرف یہ سننا چاہتی ہوں کہ آپ کب مجھے اس مجبوری اور اب زبردستی کے
 بندھن سے نجات دلا رہے ہیں؟“
 ”کبھی نہیں۔“ اس نے اطمینان سے اس کے سر پر ہم دے مارا کہ اُسے سنہلنے میں کتنی
 دیر لگی۔

پھر جب بولنے کے قابل ہوئی تو انتہائی نفرت سے بولی۔
 ”احسان فراموش ہیں آپ۔ اور سن لیں کہ میں مر جاؤں گی لیکن آپ کا ساتھ قبول
 نہیں کروں گی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

☆☆☆

اُس کی آخری اُمید اب نہ تھی کہ شاید وہی کچھ کرے گی لیکن ابھی تک اس نے خط کا
 جواب نہیں دیا تھا۔ اُسے خط لکھے ہوئے بھی ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ بہر حال وہ بڑی شدت
 سے منتظر تھی۔

پھر نہ کا خط تو نہیں آیا البتہ اس کے لیے ایک دو جگہ سے پیغام آ گئے جس سے وہ بُری
 طرح بوکھلا گئی۔ اور اس وقت تو وہ پاگلوں کی طرح فہمی کو دیکھنے لگی تھی جب اس نے بتایا کہ اباجی
 بڑی سنجیدگی سے ابتمام احمد کے رشتے پر نہ صرف غور کر رہے ہیں بلکہ چھان بین بھی کر رہے ہیں
 ”یہ کیسے ممکن ہے بھلا؟“ اس کا ذہن جو کچھ سوچ رہا تھا اسی حساب سے اس کے منہ
 سے نکلا۔

”کیوں ممکن نہیں ہے؟“ فہمی اُلٹا اسی سے پوچھنے لگی تو وہ سر جھٹک کر بولی۔
 ”میرا مطلب ہے ابھی تو میں امتحانوں سے فارغ ہوئی ہوں اور ابھی سے اماں اور
 اباجی کو میری شادی کی فکر ہو گئی۔“

دوستی حال سے بھی آگاہ کیا تھا کہ گھر میں اس کی شادی کے تذکرے ہونے لگے ہیں۔ پھر بھی
 کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ اور اب ندا کی طرف سے تو وہ بالکل مایوس ہی ہو گئی تھی۔
 پتا تو اُسے یہ فکر تھی کہ ایک نکاح کے ہوتے ہوئے دوسرا نکاح کیسے ہوگا؟ وہ کس کی بیوی کہلائے
 گی؟ انہی پریشان سوچوں نے اُسے بیمار کر ڈالا۔ وہ بستر سے لگ گئی۔

اسی دوران اباجی نے اقسام احمد کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ وہ غالباً ان کے بارے میں
 مل اطمینان حاصل کر چکے تھے۔ اور وہ جو ہر طرف سے مایوس ہو کر اب شدت سے یہ دعا کرنے
 لگی تھی کہ کسی طرح اباجی انکار کر دیں تو یہاں بھی اُسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔
 فہمی نے اپنے تئیں اُسے خوشخبری سنائی تھی لیکن وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ اماں
 ناگہرا کر بھاگی چلی آئیں۔ غنیمت تھا کہ اس وقت اباجی گھر پر نہیں تھے ورنہ وہ ضرور اس سے
 والیتے۔ اماں فہمی کو ڈانٹنے لگیں۔

”کیا کہہ دیا ہے تم نے اسے جو یوں رو رہی ہے؟“
 ”میں نے کچھ بھی نہیں کہا اماں!“ فہمی اپنی جگہ بجم بنی کھڑی تھی۔
 ”کیا ہوا بیٹا.....؟ اس طرح کیوں رو رہی ہو؟“ اماں اس کا سراپنی گود میں رکھتے
 نئے چکار کر پوچھنے لگیں تو وہ اور شدت سے رونے لگی۔
 ”اس طرح مت روؤ۔ پہلے ہی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اماں نے دوپٹے کے
 سے اس کی آنکھیں اور چہرہ صاف کیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا سر تھپکنے لگیں۔
 ”پانی پیو گی؟“ فہمی اس کے سامنے نیچے گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور اس کے چہرے سے ہال
 تے ہوئے پوچھنے لگی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی طرح سسک سسک کر روتی رہی۔
 ”ضرور تم نے کچھ کہا ہے۔“ اماں پھر فہمی پر بگڑیں۔
 ”قسم لے لیں اماں! میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے تو بس.....“ فہمی کچھ کہتے کہتے

اس گھر سے دلچسپی نہیں ہے یا.....“
 یا کے ساتھ ایسی نظریں کہ وہ کٹ کر رہ گئی۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو نوکا۔ پھر
 زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولی۔
 ”خبر تو مجھے سب رہتی ہے فہمی! بس انجان بن کر تم سے پوچھنے میں مزہ آتا ہے۔“ پھر
 اس کی ٹھوڑی چھو کر بولی۔

”تم جب اپنی معلومات کا رعب جھاڑتے ہوئے اتراتی ہو تو بہت اچھی لگتی ہو۔“
 ”تم مجھے بے وقوف بنا رہی ہو۔“ فہمی منہ پھلا کر بولی۔
 ”ارے نہیں!“
 ”پھر سچ بچ بتاؤ۔ تم نے بھی اقسام احمد کو دیکھا ہے۔“
 ”نہیں۔“

”کیوں نہیں دیکھا۔ جب وہ جا رہے تھے اس وقت تم کچن میں تھیں۔ آرام سے دیکھ
 سکتی تھیں۔“
 ”ہاں! دیکھ تو سکتی تھی لیکن میں نے سوچا۔ پتہ نہیں اباجی کیا فیصلہ کریں۔ ایسا نہ ہو میں
 اس شخص کے سپنے دیکھنے لگوں اور ادھر اباجی انکار کر دیں۔“ وہ سوچ کر بولی۔
 ”میرا خیال ہے اباجی انکار نہیں کریں گے۔ اگر ایسا کرنا ہوتا تو انہیں گھر پر کبھی نہ
 بلاتے۔“ وہ قصداً خاموش رہی۔

ان دنوں وہ ذہنی طور پر تقریباً مفلوج ہو چکی تھی اور ایسا یہ تھا کہ کسی سے اپنا احوال کہہ
 بھی نہیں سکتی تھی۔ کوئی ہمد کوئی غمگسار نہیں تھا۔

کئی بار خیال آیا کہ فہمی کو بتائے کہ وہ کس مصیبت میں گرفتار ہے لیکن فہمی اس کے لیے
 کچھ نہیں کر سکتی تھی سوائے پریشان ہونے کے۔ اس لیے ہر بار بس سوچ کر رہ گئی۔
 ادھر ندا شاید اپنے بھائی کے ساتھ شریک ہو گئی تھی یا پتہ نہیں کیا وجہ تھی بلکہ اُسے نئی

”تم مجھ پر شبہ کر رہی ہو۔“ وہ تاسف سے بولی۔

”شبے کی بات نہیں ہے سچی۔ بس مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم نے اپنی آنکھوں میں کسی اور کے خواب سجا رکھے تھے۔ جن کی تعبیر نہ ملنے پر تم اس طرح ٹوٹ گئی ہو۔“

”نہیں فہمی!“ اُس نے بے حد آزر دہ ہو کر ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکالی۔

”تم خود سوچو! کیا ہمارا ماحول ہمیں خواب سجانے کی اجازت دیتا ہے۔ نہیں ناں! تو پھر تمہیں ایسا خیال کیونکر آیا؟“

”تمہاری حالت کے پیش نظر.....“ فہمی صاف گوئی سے بولی۔

”جب سے ابتسام بھائی کا پروپوزل آیا ہے تم پریشان ہو۔ اس سے میں نے یہی سوچا کہ شاید تم کسی اور کو.....“

”نہیں..... ایسی کوئی بات ہوتی تو تمہیں ضرور بتاتی۔“

وہ نظریں پُرا کر بولی اور اٹھنا چاہتی تھی کہ فہمی نے اُس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ پھر اس کا چہرہ ادنیٰ کرتے ہوئے بولی۔

”میری طرف دیکھو کہ بات کر رہی! میں مانتی ہوں کہ جو کچھ تم نے کہا وہی سچ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی کوئی بات ضرور ہے جو تم بتانا نہیں چاہتیں۔“

”تم خواہ مخواہ.....“

”خواہ مخواہ نہیں۔“ فہمی زور دے کر بولی۔

”میں تم سے چھوٹی ضرور ہوں لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اب تک کی زندگی ہم دونوں نے اس طرح گزاری ہے کہ کبھی کوئی تیسرا ہمارے درمیان نہیں آیا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہیں۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ اس کی آواز کمزور اور دھیمی ہو گئی۔

”تم اچھی طرح جان رہی ہو کہ میں کہنا نہیں بلکہ سُنا چاہ رہی ہوں..... وہ بات جو

ایک دم خاموش ہو گئی اور بغور اُسے دیکھنے لگی۔ پھر گہری سانس لے کر اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

وہ لا پرواہ ضرور تھی لیکن نادان نہیں۔ ابتسام احمد کے نام پر پھوٹ پھوٹ کر رونا اُسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ پھر وہ بڑی سنجیدگی سے اس کے گزشتہ دنوں کو سوچنے لگی۔ تب اُسے اباجی کی بات سے اتفاق کرنا پڑا کہ وہ جب سے ندا کی شادی سے ہو کر آئی ہے..... بدلی بدلی سی ہے۔ اور اس کے بدلتے انداز سے وہ اپنے تئیں یہی نتیجہ اخذ کر سکی کہ جیسا کہ عام طور پر شادیوں میں خوبصورت اتفاقات ہو جاتے ہیں۔ تو سچی کے ساتھ بھی ایسا ہی کوئی خوبصورت حادثہ ہوا ہوگا۔

فہمی اس سے ہٹ کر نہیں سوچ سکتی تھی کیونکہ وہ رسالے پڑھنے کی شوقین..... زیادہ تر افسانوی دنیا میں رہتی تھی۔ اب بھی وہ یہی سوچ رہی تھی بلکہ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی کہ ندا کی شادی میں سچی کی بالکل افسانوی انداز میں کسی سے مڈ بھیڑ ہوئی ہوگی اور پھر نہ صرف وہ پہلی ملاقات بلکہ مقابل شخص بھی اس کے دل میں یوں گھر کر گیا ہے کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ جب ہی تو ابتسام احمد کے پروپوزل کا سن کر وہ بوکھلا گئی تھی۔ اُس نے سوچا۔

”کم از کم سچی کو بتانا تو چاہیے تھا۔“ پھر خود ہی اپنی سوچ کی نفی کر دی۔

”کیا فائدہ کچھ بتانے کا۔ اُلٹا اُسے ہی برا بھلا سننے کو ملتا۔ بے چاری پُپ چاپ اپنی آگ میں جلتی رہتی۔ اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ پھر بھی مجھے تو بتانا ہی دیتی۔ کم از کم دل کا بوجھ ہی ہلکا ہو جاتا۔ میں کون سا کسی سے کہہ دیتی۔ اُسے شاید یہی خوف رہا کہ کہیں اماں اور اباجی کو خبر نہ ہو جائے۔ بہر حال میں اسے سمجھاؤں گی کہ ابتسام بھائی بھی بُرے نہیں ہیں بلکہ بہت اچھے ہیں۔ اُن کی قربت میں وہ یقیناً گزشتہ ساری باتیں بھول جائے گی۔“ پھر اُسی روز وہ موقع دیکھ کر بڑی رازداری سے سچی کے پاؤں پر بیٹھی۔

”سچ سچ بتاؤ سچی! کیا تم ابتسام بھائی سے شادی نہیں کرنا چاہتیں؟“

اس نے کچھ حیران ہو کر دیکھا تو بولی۔

”اور کون ہے وہ جس کی وجہ سے تم اتنے اچھے پروپوزل کو ٹھکراتا چاہتی ہو؟“

ناؤ! میں کیا کروں.....؟ میرے اختیار میں جتنا تھا اتنی کوشش تو کر چکی ہوں۔“

آخر میں وہ بے بسی سے کہتے ہوئے پھر رو پڑی تو فہمی جو اس کی بات سن کر حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی اس کے رونے پر چونک پڑی۔

”روؤ مت.....!“

”پھر اور کیا کروں؟“

”یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا۔ پھر بھی یہ طے ہے کہ رونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

تم جاؤ..... منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ میں جب تک چائے بناتی ہوں۔ پھر ذرا آرام سے بیٹھ کر حل سوچیں گے۔“

فہمی نے اٹھتے ہوئے اسے بھی ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ پھر کچن میں چلی گئی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر اندر جانے کی بجائے وہیں کچن میں فہمی کے پاس آگئی تو فہمی نے ایک لمبا اُسے تھمایا اور دوسرا خود لے کر پوچھنے لگی۔

”اندر چلو گی یا بیس بیٹھو گی؟“

”بیس بیٹھ جاتے ہیں۔“ وہ بیڑھی کو پیر سے آگے کھینچ کر بیٹھ گئی تو فہمی نے بھی اس کی تقلید کی۔ پھر کہنے لگی۔

”میں تو یہی کہوں گی جی کہ ندا کو اس طرح نہیں جانا چاہیے تھا۔ اگر اس کی ممی کی ڈتھ ہوگئی تھی تو یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اور وہ ہمارے حالات کو بھی جانتی تھی۔ اُسے تمہارا خیال ضرور کرنا چاہیے تھا۔“

”تم کسی طرح اس کے گھر جا کر اس کے بھائی سے ملو۔ سیدھی طرح نہ مانے تو اس کا منہ توڑ دو۔“ فہمی پُر جوش لہجے میں بولی۔

”دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”اگر گھر سے نکلنے کا کوئی بہانا ڈھونڈ بھی لیں تب بھی مجھے ٹھیک طرح سے ندا کا گھریاؤ

تمہارے لیے پریشانی کا سبب بنی ہوئی ہے۔“ پھر سمجھانے کے انداز میں بولی۔

”تم شاید یہ سوچ کر خاموش ہو کہ میں کیا کر سکوں گی بھلا.....؟ اور یہ صحیح ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکوں گی لیکن اس طرح کم از کم تمہارے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔ پلیز جی! کہہ دو ورنہ میں بڑی سنجیدگی سے تم سے روٹھ جاؤں گی۔“

فہمی پہلے منت سے بولی۔ آخر میں دھمکی دی تو وہ جو پریشان سی ہوگئی تھی رونے لگی۔ فہمی نے سوچا اُسے جی بھر کے رو لینے دے۔ اس لیے ذرا پرے ہٹ کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔ لیکن وہ فوراً ہی دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔ ساتھ ہی سرگوشی میں پوچھا۔

”اماں کہاں ہیں؟“

”سوری ہیں۔“ فہمی سمجھ گئی وہ بتانے پر آمادہ ہے۔ اس لیے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

”میں واقعی بہت پریشان ہوں فہمی بہت مشکل میں پھنس گئی ہوں۔“

”کہتی جاؤ! میں سن رہی ہوں۔“ فہمی اطمینان سے بولی

لیکن جیسے جیسے وہ ندا کے گھر ہونے والا واقعہ بتاتی گئی، فہمی کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔

اور ساری بات بتا کر آخر میں وہ کہنے لگی۔

”میں چاہوں بھی تو اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر نہیں چھوڑ سکتی۔ گو کہ اکثر یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتی ہوں کہ ہو سکتا ہے اس دوران کوئی معجزہ رونما ہو جائے جو مجھے دو کشتیوں میں سوار ہونے سے بچالے اور کبھی اس نکاح کو جھٹلانے کی کوشش کرتی ہوں کہ مجبوری میں ہاں کہہ دینے سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے دونوں فریقین کی دل سے رضا مندی ضروری ہے جبکہ دونوں ہی راضی نہیں تھے۔ محض ممی کی خوشی کی خاطر ہاں کہہ دی۔ یہ ساری باتیں سوچ کر وقتی طور پر بہل ضرور جاتی ہوں لیکن اندر کہیں جو ایک پھانس سی چھپی ہے وہ زیادہ دیر تک خوش فہمی میں جتنا نہیں رہنے دیتی۔ ایک کسک ہے جو بے یقین رکھتی ہے۔ اب تم ہی

رپوچھنے لگی۔

”ہاں! اب سوچنے والی بات یہ ہے۔ بہر حال تم فکر مت کرو..... میں کوئی نہ کوئی کیب نکال ہی لوں گی۔“ فہمی نے اُسے اطمینان دلایا۔

پھر جس روز ابتسام آئے (جب سے بات طے ہوئی تھی وہ ہفتے میں ایک آدھ چکر لگایا کرتے تھے) فہمی نے اُن سے پتہ نہیں کیا کہا اور اگلے روز اماں کے گھٹنے دباتے ہوئے لجا جت سے بولی۔

”اماں! میں اور بچی بازار چلے جائیں؟“

”کیا؟“ اماں نے یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

”دیکھیں ناں اماں! بچی کی شادی ہے۔ اگر ہم دونوں اپنی پسند سے کچھ چیزیں لے میں گے تو قیامت تو نہ آجائے گی۔“

”تمہارے ابا جی!“

”ابا جی تو شام میں آئیں گے۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ بس آپ اجازت دے دیں۔ میری اچھی اماں!“ اماں کو سوچتے دیکھ کر مسکین سی شکل بنا کر بولی۔

”ہم نے آپ سے کبھی ضد نہیں کی۔ ورنہ ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ کم از کم اپنی ضرورت کی چیز تو خود لے آیا کریں۔ آخر اس میں برائی کیا ہے.....؟ سب لڑکیاں باہر نکلتی ہیں اور ابا جی نے تو ہمیں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔“

”لینا کیا ہے تمہیں؟“ اماں پر اس کی باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ پھر بھی ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

”میں شادی میں پہننے کے لیے کپڑے لے لوں گی۔ اور بچی کہتی ہے وہ جوتے اور پرس اپنی پسند سے لے گی۔“ وہ اماں کو آمادہ دیکھ کر خوش ہو کر بولی۔

”جاؤ گی کہاں؟“

نہیں ہے۔ ویسے میں ندا کے گھر جانے کا رسک لے بھی نہیں سکتی کیونکہ اس کا بھائی جس طرح حق جتا کر بات کرتا ہے۔ اگر اسی طرح اس نے مجھے روک لیا تو میں تو کہیں کی نہ رہوں گی۔“

”ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔“ فہمی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

”کیا؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”تم ابتسام بھائی سے ملو۔“

”ابتسام سے.....!“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہاں اُن کا کیا ذکر۔ تب فہمی سمجھانے کے انداز میں بولی۔

”دیکھو ناں بچی! ہم دونوں کچھ نہیں کر سکتے۔ اماں اور ابا جی کو بتایا نہیں جا سکتا۔ لے دے کے وہی ابتسام بھائی رہ جاتے ہیں۔ تم اُن سے مل کر ساری بات انہیں بتا دو۔ مجھے یقین ہے اگر وہ کچھ نہ کر سکے تو بہت خاموشی سے کنارہ کشی کر لیں گے۔ میرا مطلب ہے..... بات پھیلے گی۔“

”اور اگر انہوں نے ابا جی سے کہہ دیا تو.....؟“

”نہیں کہیں گے۔ یہی تو میں تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ وہ بہت اچھے ہیں۔ اس کا اندازہ تمہیں اُن سے مل کر ہو جائے گا۔“

وہ کچھ دیر تک فہمی کی طرف دیکھتی رہی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کی بات کا یقین کرے یا نہیں۔ اور فہمی اس کی کیفیت سمجھ کر بولی۔

”اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ابتسام بھائی تم سے شادی سے انکار کر دیں گے تو میری بہن تم بھی تو یہی چاہتی ہو۔“ اُس نے شاکی نظروں سے دیکھا تو کہنے لگی۔

”میرا مطلب ہے فی الحال یہی چاہتی ہو۔“

”اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ..... میں اُن سے کیسے مل سکوں گی؟“ وہ یونہی نظریں چرا

”اور انہیں.....؟“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولے۔

”یہ آپ انہی سے پوچھ لیں۔“ اُن کے انجان بننے پر فہمی بھی شرارت سے بولی جب کہ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں تیز اور ہاتھ ٹھنڈے۔

”بس مجھے یہیں اتار دیں۔“ فہمی نے کہا تو انہوں نے گاڑی روک دی۔ پھر آنا فانا فہمی اُتری اور اُن سے بھی کچھ کہا۔ اس کے بعد انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی کہ وہ بس دیکھتی رہ گئی۔ غالباً اس کے کمان میں نہیں تھا کہ فہمی اُسے یوں اُن کے ساتھ تنہا چھوڑ دے گی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ ذرا سی پلکیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ شفاف سڑک پر گاڑی پھیلتی جا رہی تھی اور اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ خود سے بات شروع کر سکے اور وہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد بولے۔

”کیسی ہیں آپ؟“

”جی!“ یہ اس کا جواب تھا۔

”فہمی بتا رہی تھی آپ کو کوئی ضروری بات کہنی ہے۔“

”جی!“

”گاڑی چلتے رہے یا کہیں روک دوں؟“ انہوں نے اسپید آہستہ کرتے ہوئے اُسے دیکھ کر پوچھا۔

”بس ٹھیک ہے۔“ وہ بھی کہہ سکی۔

”کیا ٹھیک ہے؟“

”میرا مطلب ہے اسی طرح۔ رُکیں مت۔“

”چلیے تو آپ بھی رُکیں مت..... کہتی جائیں کیونکہ کل سے اب تک میں مسلسل قیاس کرتا رہا ہوں کہ ایسی کیا بات ہے جو بعد میں نہیں کہی جاسکتی اور میں بالکل نہیں سمجھ پایا۔“

”وہ ایسا ہے کہ.....“ جو کچھ سوچا تھا سب ذہن سے نکل گیا تو وہ بے حد پریشان ہو کر نہیں دیکھنے لگی۔ روشن چمکتی ہوئی آنکھیں وٹڈ وٹڈ اسکرین پر جمی ہونے کے باوجود اپنی طرف دیکھتی

”یہیں قریبی مارکیٹ۔ ویسے بھی کسی اور جگہ کا ہمیں پتہ نہیں ہے۔“

”لیکن تمہارے ابا جی.....!“ اماں کو خود بھی ابا جی کا ڈر تھا۔

”ہم جلدی آجائیں گے اماں! بس آپ دیر نہ کریں۔ جلدی سے پیسے نکالیں۔“

”جلدی آ جانا۔“ اماں اٹھتے ہوئے بولیں تو اس نے وہیں سے بجی کو چلنے کا اشارہ کیا۔

پھر اماں کے پیچھے اندر گئی اور ان سے پیسے لے کر پرس میں رکھتے ہوئے اس سے بولی۔

”ہاں! دیر مت کرنا ورنہ اپنے ابا جی کو جانتی ہو۔“ اماں اُن کے پیچھے دروازے تک مسلسل یہی جملہ دہراتے ہوئے آئیں اور وہ بڑے تھل سے سُلتی ہوئی نکلیں۔ کیونکہ یہی بہت تھا کہ اماں نے اجازت دے دی تھی۔ غالباً انہیں بجی کا خیال تھا جو اب کچھ ہی دنوں کی مہمان تھی۔

جس مارکیٹ کا اس نے ذکر کیا تھا وہ گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ پیدل ہی کا راستہ تھا۔

اس لیے وہ دونوں تیز قدموں سے چلنے لگیں۔ پہلا موڑ مڑی تھیں کہ اب تمام احمد گاڑی لیے سامنے آ گئے۔

”اب تمام بھائی!“ فہمی نے سرگوشی میں اُسے مطلع کیا تو اس نے بالکل غیر ارادی طور پر سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر فوراً فہمی کے پیچھے ہو گئی۔ اس کی اس حرکت پر وہ ذرا سا مسکرائے۔ پھر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

”آئیے۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ فہمی کا ہاتھ دبا کر آہستہ آواز میں بولی۔

”بس اب ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور خبردار ان سے کوئی بات چھپانا مت!“

فہمی نے اُسے دھکیل کر آگے کیا اور بتسام کے برابر بٹھا کر خود پیچھے بیٹھ گئی۔

”کہاں چلنا ہے؟“ وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ اس لیے آپ مجھے یہیں قریبی مارکیٹ پر اتار دیجئے گا۔“

فہمی نے جواب دینے میں دیر نہیں کی۔

خندہ مچل مچل کر رو رہی تھی۔ آنکھوں میں اُتری لالی اور کناروں پر پھیلتے کاجل نے اُسے کس سینہ بنادیا تھا کہ وہ اس تمام عرصے میں ایک پل کو بھی اس کے تصور سے نکل نہیں پائے تھے۔ اگر بات ذرا سی خفگی کی ہوتی تو اُسے منانے کا تصور دلکش تھا لیکن یہ صورت حال خاصی ہتھی۔ اگر اسی وقت اپنا آپ عیاں کر دیتے تو ہو سکتا ہے وہ مجبوری کے تحت ذرا سی نادام ہو کر دتا کر لیتی جبکہ دل میں اُن کے خلاف نفرت وہ کدورت جس کا وہ اظہار کر رہی تھی اسی طرح دور ہتی۔ اور ایسی مفاہمت بھری زندگی تو وہ ہرگز نہیں گزار سکتے تھے۔

مصنوعی چہروں اور غرض میں لپٹی محبتوں کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اس لیے تو ما کے لیے ہامی نہیں بھرتے تھے کہ ممی نے انہیں جتنی بھی لڑکیاں دکھائی تھیں وہ سب میک اپ جوں میں اپنا آپ چھپائے ہوئے اور بعض ایسی تھیں جنہیں اُن کی بجائے ان کے اسٹینس سے ہاتھی۔

بالآخر وہ ایک طرح سے ممی کی آخری خواہش کے پیش نظر شادی کے لیے رضامند ہوئے تھے اور یہ صحیح ہے کہ اس کی طرح انہوں نے بھی بحالت مجبوری ہامی بھری تھی۔ لیکن پھر جب وہ دیکھا تو انہیں لگا تھا جیسے وہ مدتوں سے اسی کی تلاش میں ہوں۔ پھر اس تمام عرصے میں انہوں اس کے لیے کیا کچھ نہ سوچا تھا۔ اور انہیں یقین تھا کہ وہ بھی پوری سچائی اور ایمانداری سے اُن ساتھ محبت کرے گی لیکن وہ تو پہلے ہی مرحلے پر بڑی شدت سے نفرت کا اظہار کر گئی تھی جس انہیں خاصا شاک لگا۔

فوری طور پر سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ اُس سے کیا کہیں۔ اس پر اپنا آپ عیاں کرتے یا تے۔ ہر دو صورتوں میں محرومی تھی۔ بالآخر کتنی دیر سے سینے میں دبی سانس نے راستہ پا ہی لیا۔ اُن کی قید سے یوں آزاد ہوئی کہ ہلکی سی آواز خاموشی کے پردے چاک کر گئی۔ اور وہ جو اُن کی سے کسی بھی بات کی منتظر تھی..... سوائے آنکھوں کے پوری جان سے متوجہ ہو گئی۔ انہوں نے اسگریٹ سلگایا۔ پھر دو تین کش لینے کے بعد بولے۔

لگ رہی تھیں۔ تب وہ سر جھکا گئی اور اندر ہی اندر اپنے آپ کو حوصلہ دیتے ہوئے بمشکل بولنے پر آمادہ ہوئی تو ندا کے گھر اُس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ سب کچھ سنایا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا کہ اپنی باتوں کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے ایک نظر اُن پر ڈال سکتی۔ اور اگر جو وہ ذرا سی ہمت کر لیتی تو اُسی وقت جان لیتی کہ قریب بیٹھے ابسام احمد اس کی باتوں پر بجائے حیران ہونے کے محفوظ ہو کر مسکرا کیوں رہے ہیں۔ اور ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اُسے تمام اندیشوں سے نکال لیں کہ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر روتے ہوئے بولی۔

”بہت کمینہ اور ذلیل شخص ہے وہ اور احسان فراموش بھی۔ میں نے ندا کے کہنے پر کئی بار اُسے فون کیا اور ہر بار اُس نے بڑی ڈھٹائی سے صاف منع کر دیا کہ وہ کبھی بھی اس بندھن کو نہیں توڑے گا۔“ اور اُن کے ہونٹ جو مسلسل خوبصورت مسکراہٹ کے حصار میں تھے۔ یکنخت وہ حصار ٹوٹ گیا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول پڑی۔

”آپ ہی بتائیے۔ میں کیا کروں..... کیسے ان سے پیچھا چھڑاؤں؟“

”آپ اُس سے پیچھا کیوں چھڑانا چاہتی ہیں؟“

نانہوں نے سینے میں دبی سانس ہونٹوں تک آنے سے پہلے روک لی جس سے اُن کی آواز خاصی بوجھل ہو گئی تھی۔

”اس لیے کہ مجھے نفرت ہے اس سے۔ اگر کبھی وہ میرے سامنے آ گیا تو میں اس کا منہ نوج لوں گی۔ کسی کی مجبوری وہ بے بسی سے فائدہ اٹھانا کہاں کی شرافت ہے بھلا؟“ لمحہ بھر کو انہوں نے سوچا..... اسی وقت اپنا آپ عیاں کر دیں اور کہیں اُس سے.....

”منجیدہ خانم! میں محبتوں کے ساتھ اس بندھن کو مضبوط کرنے جا رہا ہوں اور تم توڑنے کی بات کرتی ہو۔“

لیکن اس کے منہ سے اپنے لیے اتنے نفرت انگیز کلمات سن کر اُن کے جذبوں پر اوس پڑ گئی حالانکہ دل اب بھی یہ کہنے کو مچل رہا تھا کہ وہ اسی روز اُن کے دل میں گھر کر گئی تھی جب نکاح

”اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“

”سیدھی سی بات ہے۔ میں نکاح پر نکاح تو نہیں کر سکتی اور اب یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ چاہیں تو اس شخص سے مجھے نجات دلا دیں ورنہ پھر شادی سے انکار کر دیں۔“

”میرے انکار کرنے سے کیا آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟ میرا مطلب ہے آپ اگر کے ساتھ.....“

”نہیں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”کیا حرج ہے جبکہ وہ ایسا ہی چاہتا ہے۔“

”پلیز! آپ ایسی کوئی بات نہ کریں۔“ اس نے ٹوک دیا اور وہ خاموش ہو گئے۔

اس دوران انہوں نے گاڑی واپسی کے راستے پر ڈال دی تھی۔ پھر جہاں فہمی کو چھوڑ تھا دیں روک دی تو اس نے چونک کر پہلے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اُن سے پوچھنے لگی۔

”آپ اس سلسلے میں کیا کریں گے؟“

”اس وقت میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پھر بھی آپ اطمینان رکھیں۔“ وہ اُسے دیکھ کر ہلکے

سے مسکرائے تو وہ نظریں پڑاتے ہوئے بولی۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو زحمت دی۔“

”نیور مائنڈ!“ پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ”وہ سامنے سے فہمی نظر آ

رہی ہے۔ اُسے بلانا ہے یا آپ اس کے پاس جائیں گی۔“

”میں جاؤں گی۔“ اس کے ساتھ ہی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتری۔ پھر شیشے

میں جھک کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ بول پڑے۔

”اگر آپ شکریہ ادا کرنا چاہتی ہیں تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”پھر بھی شکریہ.....!“ وہ کہہ کر پیچھے ہٹی۔ پھر فہمی کی طرف چل پڑی۔ انہوں نے کچھ

دیر تک کرا اُسے جانے ہوئے دیکھا۔ پھر وہیں سے لوٹ گئے۔

اور اس سے تو انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اطمینان رکھے لیکن اب اپنا اطمینان رخصت ہو تھا۔ اس انداز سے تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی متغیر ہوگی۔ اس کے برعکس ان کا ہاتھ کہ جب وہ اسے بتائیں گے کہ وہی ندا کے بھائی ہیں جن کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا تو وہ حیران ہوگی پھر جس طرح خفا ہوگی اسی طرح مان بھی جائے گی۔ لیکن وہ تو ندا کے بھائی کے ے میں کچھ سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ کمینہ ذلیل احسان فراموش اور نجانے کیا کچھ کہہ ڈالا۔ اگر وہ کے لیے اتنی اہم نہ ہو گئی ہوتی تو یقیناً اس کی خواہش کے مطابق فیصلہ سنا دیتے لیکن اب ایسا فیصلہ کرنا اُن کے لیے ممکن نہیں تھا۔

بہر حال انہوں نے سوچا..... وہ اس کے دل پر چھایا نفرتوں کا غبار اپنی محبتوں سے نے کی کوشش کریں گے۔ اور ابھی تو نہیں البتہ جب وہ انہیں تسلیم کرنے لگے گی۔ تب وہ اسے ساگے کہ جس بندھن کو وہ نام نہاد اور مجبوری کا نام دیتی رہی ہے اُسے انہوں نے اول روز ہی سے تسلیم کرنے کے ساتھ مضبوط اور پائیدار بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

اباجی نے شادی کی تاریخ طے کر دی تھی اور جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے اس کی فی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اب تمام احمد نے اس سلسلے میں فی کیوں اختیار کر لی ہے۔ جبکہ اُس روز تو انہوں نے کافی حد تک اطمینان دلا دیا تھا۔ وہ بار بار سے اُلجھ پڑتی۔

”تم نے پوچھا نہیں اُن سے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کیا کیا؟“

”کتنی بار تو بتا چکی ہوں۔ کہہ رہے تھے سب ٹھیک کر لوں گا۔“ بالآخر فہمی جھنجھلا گئی۔

”کب ٹھیک کریں گے؟ اب تو شادی میں بھی کم دن رہ گئے ہیں۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ساری

حال تو تم انہیں بتا چکی ہو اور وہ اطمینان سے تو نہیں بیٹھے رہے ہوں گے۔ یقیناً کچھ نہ کچھ

س کا دوپٹہ وغیرہ ٹھیک کر رہی تھیں تو ساتھ ساتھ اپنا تعارف بھی کروانے لگیں۔

”میں ابتسام کی بھابھی ہوں۔ اُن کے چچا زاد بھائی کی بیوی۔ ہمارا گھر یہاں سے
یادہ دور نہیں ہے۔ اس لیے اب اکثر تم سے ملاقات رہے گی۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے
لگیں۔

”تمہارا جب کبھی اکیلے میں دل گھبرائے..... میرے پاس آ جایا کرنا۔“

”کیا یہاں اور کوئی نہیں رہتا؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”اور کون ہو۔ ان کے والدین کی تو ڈھچھ ہو چکی ہے۔ بس ایک بہن ہے اور وہ باہر

ہتی ہے۔“

”شادی میں نہیں آئیں؟“

”آنا تو تھا اُسے لیکن اُس کی ڈیلیوری ہونے والی تھی..... اس لیے نہیں آ سکی۔ میرا

نیال ہے اب دو تین مہینے کے بعد ہی آئے گی۔“ پھر سیدھی کھڑی ہو کر اُس کا جائزہ لیتے ہوئے
لیں۔

”ماشاء اللہ! بہت پیاری لگ رہی ہو۔ نیکی سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ابتسام

ہمانوں کو رخصت کر کے آتے ہی ہوں گے۔“ پھر جاتے جاتے بولیں۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو

بتا دو۔“

”نہیں شکریہ۔“

”اچھا صبح ملاقات ہوگی۔“

وہ مسکرا کر شب بخیر کہتی ہوئی چلی گئیں تو وہ کچھ دیر تک بند دروازے پر نظریں جمائے

ٹھہری رہی۔ پھر جب یقین ہو گیا کہ وہ دوبارہ نہیں آئیں گی تو بہت آہستگی سے بیڈ سے اتر کر

رینگ روم میں آ گئی۔ پھر زیورات اُتارتے اور لباس تبدیل کرتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل

بھٹتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ابتسام کا سامنے کیسے کرے۔ بڑی مشکل سے اپنے

کیا ہوگا اور ہو سکتا ہے کوئی پرابلم ہو۔ میرا مطلب ہے خدا کے بھائی نے ہی.....“

”میں بھی یہی سوچتی ہوں۔“ وہ بال پڑی۔ ”اگر ایسی ہی بات ہے تو ابتسام کو انکار کر

دینا چاہیے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ ایک نکاح کے ہوتے ہوئے دوسرا نکاح کیسے ہوگا؟“

”اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”تم اُن سے پوچھو تو سہی۔“

”وہ آئیں تب ناں! انہوں نے تو آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“ پھر شرارت سے بولی۔ ”اب

تم جانتی رہی ہو۔ خود ہی پوچھ لیتا۔“

”کیا؟“ وہ اُسے گھورنے لگی۔ ”تمہیں مذاق سوچ رہا ہے؟“

”بس کروجی! مت اس طرح مجھے گھورو۔ کتنا ارمان تھا تمہاری شادی کا کہ یہ کروں گی

وہ کروں گی اور تم ہو کہ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پریشان کر رہی ہو۔ نہ ہنسنے بولنے دیتی ہو نہ مذاق

کرنے دیتی ہو۔ اور کون سے ہمارے دس بہن بھائی بیٹھے ہوئے ہیں جن کی شادیوں پر ہم اپنے

ارمان نکالیں گے۔“

فہمی بولے جارہی تھی اور وہ سناٹوں میں گھرتی چلی گئی۔

پھر یہ چند دن یوں گزرے کہ وہ چپ چاپ ہر بات سُلتی اور ہر تیاری ہوتے دیکھتی

رہی۔ اُس کے بعد اُس نے فہمی کو بھی نہیں ٹوکا جو خاصا جوش و خروش دکھا رہی تھی۔

”پتہ نہیں میرے نصیب میں کیا لکھا ہے؟“ آخر میں اُس نے بے بسی سے سوچا تھا۔

اور بے شمار اندیشوں میں گھری اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔

جب وہ ابتسام کے سنگ اُن کے گھر میں داخل ہوئی تو وہاں کچھ زیادہ گہما گہمی نہیں

تھی۔ بس گنتی کے چند لوگ تھے۔ ایک خاتون اُسے جلد عروسی میں لے آئیں۔ بیڈ پر بٹھا کر جب

”وہ شخص تیار نہیں ہوا۔ اُس کا کہنا ہے کہ وہ آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

”آپ نے اُسے بتایا نہیں کہ میں کبھی بھی اُسے تسلیم نہیں کروں گی۔“

اس کے لیے جس طرح نفرت سمٹ آئی تھی اس سے وہ فوراً کچھ نہیں کہہ سکے۔ خاموشی سے اُٹھ کر میبل تک گئے۔ گلاس میں پانی ڈالا لیکن پھر پیچھے بغیر ہی دوبارہ آکر بیٹھ گئے وہ کہنے لگی۔

”جب آپ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوا تھا تو پھر آپ نے شادی کی ہامی کیوں بھری؟“

”آپ کا مطلب ہے میں انکار کر دیتا؟“

”ہاں!“

”جتنی آسانی سے آپ ہاں کہہ رہی ہیں۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا سنجیدہ خانم! اس لیے کہ بات میری طرف سے شروع ہوئی تھی اور اس اسٹیج پر پہنچ گئی کہ اگر میں انکار کر دیتا تو آپ کے لدین کو پریشانی ہوتی۔“ وہ جزبہ ہو کر ہاتھوں کی انگلیاں مردھنے لگی تو انہیں اس پر رحم کے بائے غصہ آنے لگا کہ وہ کیوں کٹھور ہے کہ انہیں بھی بری طرح نظر انداز کر رہی ہے۔

”پھر اب میں کیا کروں؟“ وہ اُن کے خاموش ہو جانے پر الجھ کر پوچھنے لگی تو وہ اُٹھتے دئے چڑ کر بولے۔

”آرام سے سو جائیں۔“

”جی!“ وہ اُن کے انداز اور لہجہ پر غور کرنے لگی اور بے خیالی میں نظریں بھی اُن ہی پر نائے بیٹھی تھی۔ تب انہیں کہنا پڑا۔

”آپ کا بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس سارے قصے کی آپ کے والدین کو خبر نہیں ہونی چاہیے تو لمینان رکھیں..... انہیں خبر نہیں ہوگی۔ اور مجھ پر اعتماد کیا ہے تو صبر کے ساتھ انتظار بھی کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چلیے اب آپ سو جائیں۔ مزید اس مسئلے پر صبح بات کر لیں گے۔“ پھر تے جاتے پلٹ کر بولے۔

آپ کو سمجھا بجھا کر ڈریسنگ روم سے نکلی تو پہلے مرحلے پر ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔ وہ کمرے کے بچوں بچ کھڑے ستلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ اُسے دیکھا تو اطمینان بھرا سانس لیا۔ اور آپ ہی آپ دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیلنے لگی تھی کہ اس نے زرد سی ہو کر پلکیں جھکا لیں۔ گو کہ وہ اس وقت بڑی سنجیدگی سے اس سے بات کرنے آئے تھے لیکن شاید ماحول کا اثر تھا کہ بے اختیار اُس کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

”میں تو بڑا حسین تصور لے کر آیا تھا کہ اس مسہری پر کوئی بڑے سے آجھل میں اپنے آپ کو چھپائے میری آہٹوں کو اپنی دھڑکنوں کے ساتھ شمار کرتا ہوگا۔“ اُس نے شاکی نظروں سے دیکھا تو انہوں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ پھر گہری سانس لے کر بولے۔

”آپ کھڑی کیوں ہیں.....؟ بیٹھیں ناں!“ وہ مسہری کے کنارے قدرے تکلف سے بیٹھ گئی اور خود سے کچھ پوچھنے کے بجائے اُن کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ جبکہ انہوں نے پہلے سگریٹ سلگایا۔ پھر دو تین کش لینے کے بعد بولے۔

”مجھے احساس ہے کہ آپ نے یہ عرصہ بہت پریشانی میں گزارا ہوگا اور ہو سکتا ہے مجھ سے بھی متنفر ہو گئی ہوں۔“

”نہیں۔“

”کیا نہیں؟“ وہ اُس کی ہلکی سی آواز پر اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”میرا مطلب ہے میں پریشان ضرور رہی..... لیکن آپ سے.....“ وہ بات پوری نہیں کر سکی۔

”واقعی!“ انہیں خوشی ہوئی اور وہ اظہار بھی کر گئے۔ ”مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا۔ بہر حال اس تمام عرصے میں میں اطمینان سے نہیں بیٹھا رہا۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کو اس بندھن سے نجات دلا دوں لیکن.....“

”لیکن.....!“ وہ سانس لینے کو ز کے تھے کہ وہ بے صبری سے بولی۔

”ہاں!“ وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ ”مجھے اس سلسلے میں سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ فیصلہ تو اسی وقت اُس نکاح سے پہلے ہی ہو گیا تھا اور میں اب بھی اس پر قائم ہوں۔“

وہ کچھ دیر تک اس پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ پھر بظاہر چائے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

”آپ نے فیصلہ کر لیا۔ لیکن اگر اُس شخص نے کوئی دعویٰ کر دیا جس کے نتیجے میں اگر ہمارے نکاح کو فسخ قرار دے دیا گیا تب.....؟“

”تب.....؟“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ وہ چونک کر اُنہیں دیکھنے لگی اور پھر کتنی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ قدرے مطمئن سی تھی اور اب اُن کی بات سے پل میں سارا اطمینان چھین لیا تھا۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ انہوں نے کہا تو وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ سر جھٹک کر بولی۔

”کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟“

”بالکل! اگر وہ شخص علی الاعلان یہ دعویٰ کر دے کہ آپ اس کی بیوی ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ آپ اُس کے ساتھ روانہ ہو جائیں۔“ وہ پتہ نہیں اُسے ڈرار ہے تھے یا ایک بار پھر اپنے بارے میں کچھ سننا چاہتے تھے۔

”نہیں!“ وہ سر کو زور زور سے نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اُس کے ساتھ جانے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اول تو میں اُس نکاح کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ پھر بھی اگر اُس کی کوئی اہمیت ہے جس کے زور پر وہ کوئی دعویٰ کرے گا تو بدلے میں میں بھی دعویٰ کر دوں گی اس سے فوری علیحدگی کا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”یہ کام میں پہلے بھی کر سکتی تھی لیکن ایک تو حالات اجازت نہیں دیتے تھے۔ دوسرے

”البتہ آپ یہ فیصلہ ضرور کر لیجئے گا کہ کون سے نکاح کو قائم رکھنا چاہتی ہیں۔“

”میرے خدا!“ اُن کے جاتے ہی اُس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ ”عجیب آدمی ہیں..... کہتے ہیں میں سو جاؤں۔ بھلا ان کی باتیں مجھے سونے دیں گی؟“

پھر طویل سانس لے کر اُنھ کھڑی ہوئی۔ بہت دیر سے طق خشک ہو رہا تھا۔ نیبل کے پاس جا کر پانی پیا۔ پھر آ کر لیٹی تو از سر نو ان ساری باتوں کو سوچنے لگی۔ اُسے محسوس ہوا کہ ساری پریشانیوں کے باوجود اس کے اندر کہیں تھوڑا بہت اطمینان موجود ہے اور یہ اطمینان ابتسام احمد کی ذات کا مرہون منت تھا۔

☆☆☆

رات دیر سے سونے کے باوجود صبح وہ معمول کے مطابق اُنھی۔ اور شاید نیند کی کمی کے باعث ہی سر بوجھل ہو رہا تھا اور آنکھیں قدرے سرخی مائل..... اُس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا تو وہ لان میں چہل قدمی کرتے نظر آئے۔ گاؤں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُن کا انداز سوچتا ہوا سا تھا۔ اور اس وقت تو اس نے غور نہیں کیا۔ البتہ جب اُن کے مقابل ناشتے کی نیبل پر بیٹھی تب اُن کی غیر معمولی خاموشی کا نہ صرف احساس ہوا بلکہ اپنے آپ میں بڑا عجیب سا بھی محسوس کرنے لگی تھی۔ کچھ جھجکتے ہوئے سلاکس کی پلیٹ اُن کے سامنے رکھی۔ پھر چائے بنانے لگی۔

وہ کن اکھیوں سے اُس کا جائزہ لینے لگے اور کیونکہ خود ڈسٹرب تھے اس لیے اُسے بھی چھیڑنے سے باز رہ سکے۔

”پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے؟“

”کیسا فیصلہ؟“ فوری طور پر واقعی اُسے یاد نہیں آیا۔ اور وہ سمجھے قصداً انجان بن گئی ہے۔ جب ہی بغور اُسے دیکھنے لگے۔ صبح کے اُجالے میں اُس کا دھلا دھلا چہرہ ہلا کی سادگی لیے ہوئے تھا۔ تب اُنہیں کہنا پڑا۔

”غالباً رات میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کو ہم دونوں میں سے کسی ایک کو.....“

کو بات کرنی چاہیے۔ اس کے ارادے معلوم ہو جائیں پھر میں کچھ کر سکوں گا۔“
 ”جی!“ وہ کچھ سوچتی ہوئی اٹھ کر کمرے میں جانے لگی تو وہ پکار کر بولے۔
 ”میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ایک دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ اگر آپ کہیں
 تو آپ کو باجی کے گھر چھوڑ دوں؟“

”نہیں۔“ وہ اسی قدر کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔ اپنے آپ کو عجیب مشکل میں محسوس کر
 رہی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ آخری بار جب اُس نے اُسے فون کیا تھا اور یہ پوچھا تھا کہ وہ کب اُسے
 اس بندھن سے نجات دلا رہا ہے تو جواب میں وہ کتنے اطمینان سے بولا تھا..... ”کبھی نہیں۔“ اُسے
 اب بھی اپنے آس پاس کبھی نہیں، کبھی نہیں کی آوازیں سنائی دینے لگیں تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی
 ہوئی۔

”مجھے ابھی اس سے بات کر لینی چاہیے۔ ابتسام بھی موجود نہیں ہیں۔ ورنہ اُن کے
 سامنے مشکل ہوگی۔“

اس نے سوچا اور فون کرنے کی غرض سے کمرے سے نکلی ہی تھی کہ ابتسام کی بھابھی آ
 گئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ جزبہ ہوئی لیکن بظاہر مسکرا کر استقبال کیا۔
 ”تم ایک رات کی دہن کن کاموں میں ابھی ہو۔“ وہ اُسے گلے لگا کر پیار کرتے
 ہوئے بولیں۔

”کام تو کوئی نہیں ہے۔“ وہ اُن کے ساتھ چلتی ہوئی لاؤنج میں آ بیٹھی تو وہ ادھر ادھر
 دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”ابتسام کہاں ہے؟“

”وہ کسی ضروری کام سے ابھی نکلے ہیں۔“

”اُس کے ضروری کام کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اور ہاں فون پر اُس نے بتایا ہے کہ
 ویسے کی تقریب ملتوی کر دی ہے۔“

کوئی میرے ساتھ نہیں تھا۔ اور اب تو ابتسام احمد آپ میرے ساتھ ہیں۔ آپ میری مدد کریں گے
 ناں!“ انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ پھر چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں
 سے لگالیا۔ ایک دو سہ لینے لے بعد کہنے لگے۔

”پہلے ناشتہ کر لیں، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ اُس نے محض اُن کی بات رکھنے کی خاطر سلائس
 کی پلیٹ اپنی طرف کھسکالی۔ ورنہ کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ انہوں نے بڑی عجلت میں
 چائے ختم کی اور کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اُسے
 ڈھنگ سے ناشتہ کرنے کی تاکید کرتے گئے۔

”اب کیا ہوگا؟“ وہ پھر الجھ گئی۔ ”اگر ابتسام کا خدشہ درست نکلتا تب تو بڑی مشکل ہو
 جائے گی۔ پھر پہلے مجھے اس سے طلاق حاصل کرنی ہوگی۔ اس کے بعد پتہ نہیں ابتسام دوبارہ مجھ
 سے شادی پر تیار ہوں گے کہ نہیں۔ اللہ میاں میں تو مر جاؤں گی۔“ یہ ساری باتیں سوچ کر وہ رو
 دینے کو تھی کہ انہیں آتے دیکھ کر سنبھل گئی۔

”اس طرح پریشان ہونے اور رونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“ اپنے طور پر وہ سنبھل
 چکی تھی لیکن چہرہ اندرونی کیفیت کا غماز تھا۔ جب ہی انہوں نے ٹوکا تو وہ ایسی نظروں سے دیکھنے
 لگی جیسے پوچھ رہی ہو۔ ”میں کیا کروں؟“

”آپ ایک بار اُسے فون کریں اور پوچھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔“

”میں اُسے فون نہیں کرنا چاہتی۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ بہت بد تمیز آدمی ہے۔ پتہ نہیں کیا کہہ دے۔“

”یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے کہ وہ کیا کہتا ہے۔“

”تو پھر آپ خود اس سے بات کر لیں۔“

”میں.....!“ انہوں نے قصداً تعجب کا اظہار کیا۔ پھر کہنے لگے۔ ”نہیں! اب آپ ہی

”جی!“

”کیوں؟“

”اُن کی ایک ہی تو بہن ہے۔ اُن کا کہنا ہے اُس کے آنے پر کوئی تقریب کر لیں گے۔“ اُسے ابتسام نے کہا تھا اُس نے وہی کہہ دیا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ دو تین مہینے بعد آئے گی تو کیا اس وقت ولیہ ہوگا؟“

”ولیہ نہیں..... بس کوئی بہانہ ہو جائے گا۔“ پھر اس موضوع سے ہٹنے کی خاطر بولی۔

”آپ چائے نہیں کی یا.....؟“

”نہیں بھئی! میں ابھی ناشتہ کر کے آرہی ہوں۔ بلکہ میں تو یہ دیکھنے آئی تھی کہ تم لوگوں

نے بھی ناشتہ کیا یا نہیں۔“

”جی کرلیا۔“

”اور یہ تم نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔ اگر اس وقت تمہارے میکے سے کوئی آجائے تو کیا

کہے۔“ وہ اُس کے سادہ کپڑوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں تو اُس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

”چلو! میں تمہارے لیے کوئی دوسرا سوٹ نکالتی ہوں۔“

”ابھی نہیں بھابھی! شام میں پہن لوں گی۔“

اس نے بڑی مشکل سے انہیں روکا۔ پھر وہ ادھر ادھر کی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ تو اُسے

اُبھرنے لگی۔ بار بار اُن کی نظر بچا کر گھڑی کی طرف دیکھتی۔ ابتسام کو گئے ہوئے ایک گھنٹے

سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی اُن کے آنے سے پہلے ندا کے بھائی کو فون کر لے۔ لیکن

بھابھی جیسے فراغت سے آ بیٹھی تھیں۔ عام حالات میں تو وہ اُن کے خلوص کی معترف ہوتی لیکن

اب کیونکہ وہ اپنے مسئلے میں اُبھھی ہوئی تھی۔ اس لیے اُس کا جم کر بیٹھنا ناگوار گزر رہا تھا۔ پھر بھی

کوشش یہی تھی کہ ناگواری یا بیزارگی ظاہر نہ ہو۔ اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی تھی لیکن دھیان سے

ن کی باتیں نہیں سن پارہی تھی۔ کسی وقت وہ اپنی کسی بات کا جواب مانگتیں تب وہ ہونقوں کی

روح دیکھنے لگتی۔ پھر خجالت مٹانے کو یونہی سر ہلانے لگتی۔

”تم کچھ تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ میرا خیال ہے نیند پوری نہیں ہوئی۔“ آخر وہ خود ہی

مجھ کر کہنے لگی۔

”نہیں بس!“ اُس نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

”ابتسام نے بھی صبح جا، اُٹھا دیا ہوگا۔ وہ تو ایسا ہی ہے دُنیا ادھر کی ادھر ہو جائے

س کی روٹین چینیج نہیں ہو سکتی۔“ پھر اُٹھتے ہوئے بولیں۔ ”میں چلتی ہوں۔ ابتسام سے کہنا شام

بس تمہیں لے کر میری طرف آئے۔“

”جی! لیکن آپ جا کیوں رہی ہیں..... بینصیں ناں! ابتسام ابھی آتے ہوں گے۔“

اس نے اخلاقاً روکا۔

”نہیں! بس اب چلوں گی۔“ وہ انہیں چھوڑنے باہر تک آئی۔ پھر واپسی میں نیلی فون

سیٹ اپنے کمرے میں اُٹھا لائی۔ اور جلدی جلدی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اُمید تو نہیں تھی کہ ندا کے

بھائی گھر پر ہوں گے۔ پھر بھی اس نے سوچا وہ آئندہ کے لیے میسج دے دے گی۔ دوسری طرف

مسلسل بیل جا رہی تھی۔ وہ انتظار کرنے لگی۔ پھر جیسے ہی کسی نے ریسپور اُٹھایا وہ بڑی عجلت میں

بول پڑی۔

”ندا کے بھائی ہاں گئے؟“

شاید وہ ملازم تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ دفتر گئے ہیں تو اُس نے دفتر کا نمبر پوچھا۔ اُس

نے ہولڈ کرنے کو کہا اور پھر کچھ دیر بعد دفتر کا نمبر بتا دیا تو اُس نے دفتر فون ملا لیا۔

”ہیلو!“

”کون..... سنجیدہ خانم!“ لہجے میں قدرے غیر یقینی کے ساتھ اشتیاق بھی تھا۔ اور وہ

اُس کے فوراً پہچان لینے پر دل ہی دل میں قائل ہوتے ہوئے بولی۔

”میں نے بہت ٹرائی کی لیکن.....“ ان سے نظریں پڑاتے ہوئے وہ اس قدر کہہ کر خاموش ہو گئی تو انہوں نے مشورہ دیا۔

”اگر آپ سے نمبر نہیں مل رہا تو کال بک کرا لیں۔“

”آپ..... میرا مطلب ہے آپ یہ کام کر دیں۔“

”میں ندا سے بات کروں؟“ انہوں نے تعجب ہو کر اپنی طرف اشارہ کیا تو وہ ہنسا کر بولی۔

”نہیں! بات تو میں کر لوں گی۔ بس آپ کال بک کرا دیں یا پھر کوشش کریں۔ شاید آپ سے نمبر مل جائے۔“

”اچھی بات ہے۔ لائیے نمبر۔“ وہ اسی وقت تیار ہو گئے تو وہ جلدی سے کمرے میں جا کر ندا کا نمبر لے آئی۔ چھوٹا سا کاغذ اس کے سامنے ٹیبل پر رکھا۔ پھر بظاہر سائڈ سے میگزین اٹھا کر اُس کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئی۔ وقت بوقت سے کن اکھیوں سے انہیں بھی دیکھ لیتی جن کی انگلیاں مسلسل ذائل پر حرکت کر رہی تھیں۔ پھر اچانک خاموشی چھا گئی اور چند لمحوں بعد ان کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو! آپ کون ہیں؟“ وہ میگزین رکھ کر پوری طرح اُن کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”ندا سے کہیے پاکستان سے اُن کی کال ہے۔ سنجیدہ خانم بات کریں گی۔“ پھر اشارے سے اُسے قریب بلا کر ریسپور اُسے تھما دیا اور خود اُنٹھ کھڑے ہوئے۔

”ہیلو کون ہجی!“ ندا کھٹکتی ہوئی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ اُس نے فوراً جواب نہیں دیا۔ جب ابتسام وہاں سے چلے گئے تب گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں! میں ہوں۔“

”کیسی ہو جی؟ بلکہ اب تو تمہیں بھابھی کہنا چاہیے۔“ ندا شوخی سے بولی تو وہ دبی دبی

”جی..... میں ہی ہوں۔“

”کیسے اتنے دنوں بعد کیسے ہماری یاد آ گئی؟“ وہ یوں بولا جیسے اس سے بڑی اچھی دوستی ہو۔

”مجھے ندا کا فون نمبر چاہیے۔“ وہ اچانک اُس سے بات کرنے کا ارادہ ترک کر گئی۔

”خیریت! کیا میری شکایت کریں گی؟“

”میرے پاس ایسی فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ بس آپ نمبر دیں۔“ وہ تھکے لہجے میں بولی۔

”ابھی لیجئے!“ وہ نمبر بولنے لگا اور وہ جلدی جلدی نوٹ کرنے لگی۔

”اور کوئی حکم؟“

”جی نہیں شکریہ۔“ وہ فون رکھنے لگی تو وہ بول پڑا۔

”ایک بات تو بتائیے! میں بارات لے کر کب آؤں؟“

”سٹ آپ!“ وہ تقریباً چیخی اور ریسپور بیچ دیا۔ اُسے بے حد غصہ آ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا سامنے جا کر اُس کا منہ نوچ لے۔ کتنے اطمینان سے بات کرتا تھا۔ ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی مشکل میں ہے۔ دل ہی دل میں اُسے بے شمار گالیاں دیتی ہوئی اُنھی تو پہلے ٹیلی فون سینٹ لے جا کر لابی میں رکھا۔ پھر کچن میں آ کر خانساماں سے دوپہر کے کھانے کے بارے میں پوچھنے لگی۔

☆☆☆

اگلے کئی دن ندا کو فون کرنے کی کوشش میں صرف ہو گئے۔ اس کا نمبر مل کے نہیں دے رہا تھا۔ اور اب تو اُسے ابتسام احمد کے سامنے بے حد خجالت محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ وہ دن میں ایک بار بڑی سنجیدگی سے اُس سے پوچھتے تھے۔

”ندا سے بات کی آپ نے؟“

آواز میں جیتی۔

”کیا؟“ پھر دانت پیٹتے ہو ”خبردار جو مجھے بھا بھی کہا۔“

”کیوں.....؟ تمہیں پسند نہیں ہے کیا؟“

”یہ مذاق چھوڑو ندا! اور مجھے بتاؤ کہ تمہارا بھائی کیا چاہتا ہے؟“

”میرے بھائی تمہیں اپنا نا چاہتے ہیں اور وہ.....“

”یہ ناممکن ہے۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”اور سنو ندا! تم لوگ میرے ساتھ اچھا نہیں کر

رہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اور تمہارا بھائی مجھے دھوکہ دو گے تو میں کبھی تمہارے گھر آتی بھی نا۔“

”ہم نے تمہیں دھوکہ نہیں دیا جی! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”میں سب سمجھ چکی ہوں کہ تم کبھی بھی میری دوست نہیں تھیں۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ اگر دوستی کا دعویٰ ہے تو اپنے بھائی سے کہو میری مجبوری

سے فائدہ نہ اٹھائے۔ جو بات اول روز تم نے اور تمہاری کزن نے طے کی تھی اُس پر فوراً عمل کرو

ورنہ مجھے مجبوراً کورٹ سے رجوع کرنا پڑے گا۔“

”میری بات سُنو جی!“ ندانے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ ”اُس وقت حالات ہی ایسے

تھے۔ ہماری عقل بالکل کام نہیں کر رہی تھی۔ تمہارے رونے دھونے اور ڈرنے سے ہم اس کے

علاوہ اور کچھ سوچ ہی نہیں سکے۔ اور اب تمہارے بارے میں سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ

اس بندھن کو توڑنے کی بجائے مضبوط کر لینا چاہیے۔ ویسے بھی بھائی جان کا کہنا ہے کہ انہیں جس

لڑکی کی تلاش تھی وہ تم ہو۔“

”خدا کے لیے ندا.....!“ وہ سچ سچ چیخ پڑی۔ ”ایسی باتیں مت کرو۔ پتہ بھی ہے اب

میری شادی ہو چکی ہے۔“

”کیا!“ ندا کے منہ سے بھی چیخ نما آواز نکلی تھی۔

”ہاں! ابتسام احمد میرے شوہر ہیں۔ میں نے اول روز ہی انہیں ساری بات بتا دی

۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ انہوں نے نہ صرف سنجیدگی سے میری بات سنی بلکہ اب مجھے موقع بھی

رہے ہیں کہ میں تمہارے بھائی سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ ورنہ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اسی

کھڑے کھڑے مجھے اپنے گھر سے نکال دیتا۔“ قدرے توقف کے بعد کہہ لگا۔

”اب میں اکیلی نہیں ہوں۔ ابتسام میرے ساتھ ہیں۔ اول تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ

ت سے یہ مسئلہ حل ہو جائے ورنہ ہمیں دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔“

”لیکن جی!“ وہ اُس کی بات سُنے بغیر بول پڑی۔

”میرا نمبر لکھ لو اور اپنے بھائی سے بات کر کے جلدی مجھے بتاؤ کہ وہ کیا کہتا ہے۔“ پھر

نمبر بتانے لگی۔

”تم نے میرے بھائی جان سے بات کی تھی؟“ ندا نمبر نوٹ کرنے کے بعد پوچھنے

”ہاں! ایک بار نہیں کئی بار..... اور معاف کرنا ندا تمہارے بھائی جان بہت بدتمیز

انہیں میری مجبوری کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔“

”نہیں..... ایسی بات نہیں ہے۔“

”ندا صفائی میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ پھر اس

پہلے کہ ابتسام اس کی طرف آتے۔ وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس وقت وہ اُن کا سامنا

رنا چاہتی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ وہ پوچھیں گے ندا سے کیا بات ہوئی اور ندانے خود اسے کوئی

افزا جواب نہیں دیا تھا۔ تو وہ انہیں کیا بتاتی۔ اُسے ندا پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی

اداری کرنے لگی تھی۔ بہر حال اس بار اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دو دن کے بعد ہی ندا کا

گیا جس کی وہ شدت سے منتظر تھی۔ اور اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ کہنے لگی۔

”سنو! میں نے اپنے بھائی جان سے بات کی ہے اور وہ کسی طرح بھی تمہیں چھوڑنے

پر آمادہ نہیں ہیں۔“ اُس کا دل تو چاہا اُسے بے نقط سنائے لیکن اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔
”تم نے انہیں بتایا نہیں کہ میری شادی ہو چکی ہے؟“

”بتایا تھا اور اس پر تو وہ بہت ہی خفا ہو رہے تھے۔ کہہ رہے تھے میرے نکاح میں ہوتے ہوئے وہ کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی۔ اور یہ بھی کہا کہ میں اس پر تو نہیں اس کے میاں پر دعویٰ کر دوں گا کہ.....“

”بس کروندا.....!“ اس نے فوراً نوک دیا۔ جس بات کا ذکر تھا وہی ہو رہی تھی۔

”اب بتاؤ میں کیا کروں؟“ ندا پوچھنے لگی۔

”تم کیا کر سکتی ہو؟ اب تو جو کرنا ہوگا میں خود ہی کروں گی۔“

اُس نے تلخی سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر ادھر وہ تو یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی تھی کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیے۔ اور ادھر اہتمام اطمینان سے فون پر ندا سے بات کر رہے تھے۔ ندا انہیں اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو سنانے کے بعد کہنے لگی۔

”بس کریں بھائی! وہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔ اب ختم کریں یہ ڈرامہ.....“

”تم اسے ڈرامہ کہتی ہو۔ بخدا! میرا اسے تنگ کرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ وہ تو اس کے منہ سے نفرت انگیز کلمات سن کر مجھے اپنا آپ چھپانا پڑا۔ ورنہ میں اسی وقت بتا دیتا کہ میں کون ہوں۔“

”بہر حال..... میرے آنے سے پہلے ہی آپ سب ٹھیک ٹھاک کر لیں ورنہ وہ مجھ سے بہت لڑے گی۔“

”میں کوشش کروں گی کہ.....“ اُسے آتے دیکھ کر انہوں نے بات وہیں چھوڑ دی اور جلدی سے خدا حافظ کہہ کر ریسور رکھ دیا۔ پھر اُس کے قریب آنے پر بغور اُسے دیکھتے ہوئے بولے۔

”کیا بات ہے۔ کچھ پریشان ہیں؟“

”ہاں!“ اُس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ پھر قدرے تکلف سے صوفے پر ہوئے بولی۔

”میں ندا سے بات کر چکی ہوں۔ میرا خیال ہے وہ اپنے بھائی کو سمجھانے میں ناکام ہے۔“

”پھر؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ جواب اپنے طور پر اُس مسئلے کا حل سوچ چکی س کے مطابق کہنے لگی۔

”آپ مجھے کچھ دنوں کے لیے اماں کے گھر چھوڑ دیں۔“

”کیوں؟“ وہ ٹھٹھکے۔

”کیونکہ میں سمجھتی ہوں میرا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ ابھی تو یہ بھی سنا ہوا کہ میری آپ کے ساتھ شادی صحیح ہے یا نہیں۔ بس آپ مجھے اماں کے گھر جانے میں پہلے اس شخص سے نمٹ لوں اس کے بعد دیکھا جائے گا۔“

”کیا کریں گی آپ؟“ وہ فوراً پوچھنے لگے۔

”اُس سے خلع لوں گی۔“

”دیکھئے سنجیدہ خانم!“ وہ اس کی پوری بات سننے بغیر بول پڑے کیونکہ ایک تو وہ اُس کی ہڈ چکے تھے۔ دوسرے یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں وہ اپنی بات پر قائم رہ کر ضد نہ کر بیٹھے۔

”آپ کچھ دنوں کے لیے اپنی والدہ کے گھر جانا چاہیں تو ضرور جائیں لیکن میں اس کی نہیں دوں گا کہ آپ کورٹ کچہری کے چکر لگاتی پھریں۔“

”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ سب آپ کریں۔ میں جو ہوں۔“ وہ اٹھا کر دیکھنے لگی تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”میں اب تک اس مسئلے سے الگ اس لیے رہا کیونکہ میرا خیال تھا کہ آپ کی دوست

”سارا دن تم کیا کرتی رہتی ہو؟“

”کچھ نہیں بس بور ہی ہوتی رہتی ہوں۔ کسی کسی دن ان کی بھانج آ جاتی ہیں تو کچھ وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ البتہ شام میں ابتسام کہیں نہ کہیں لے جاتے ہیں تو سارے دن کی بوریت دور ہو جاتی ہے۔“ آخر میں اُسے جھوٹ کا سہارا لیتا پڑا۔

”چلو! تمہاری بوریت دور تو ہوتی ہے جبکہ یہاں تو اب تک وہی عالم ہے۔ ایک دن ابا جی سے کہا مجھے تمہارے ہاں لے چلیں تو بجز کر بولے تھے۔ کیا ضرورت ہے.....؟ تم وہاں جا کر کیا کر دو گی؟ سچی سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے تو وہ خود چکر لگا جائے گی۔“

فہمی ابا جی کے لہجے کی نقل اُتارتے ہوئے بولی تو وہ اماں سے پوچھنے لگی۔

”کیوں اماں! کیا ابا جی میرے گھر بھی نہیں آنے دیتے؟“

”تمہیں پتہ تو ہے وہ کسی کے گھر نہیں جانے دیتے۔“

”میں کسی نہیں ہوں اماں اور پھر میرے کون سے اتنے سسرال والے بیٹھے ہوئے

ہیں۔ اکیلا گھر ہے۔ اگر فہمی آ جائے گی تو کون سی قیامت آ جائے گی۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی تو اماں کو کہنا پڑا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ اب تمہارے ابا جی صبح کے گئے شام کو آتے ہیں۔ اس کے بعد ان

میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ اسے کہیں لے جائیں۔“ اس کا دل چاہا کہہ دے آپ لے آیا کریں۔

لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش رہی۔ البتہ فہمی منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی تھی۔ اور جب اماں اٹھ

گئیں تب فوراً سرگوشی میں پوچھنے لگی۔

”اور سچی! اُس کا کیا ہوا؟“

”ابھی تک تو معاملہ وہیں اٹکا ہوا ہے۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”ابتسام بھائی کیا کہتے ہیں؟“

”اب تک تو انہوں نے مجھے چھوڑا ہوا تھا۔ میں نے ندا سے فون پر بات کی لیکن وہ بھی

آپ کے ساتھ تعاون کرے گی۔ لیکن اب جب کہ معاملہ بجائے سلجھنے کے اُٹھنے لگا ہے تو میں محض تماشاخی نہیں بن سکتا۔ آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ وہ شخص آپ کا کیا بازو سکتا ہے۔“

”ندا کہہ رہی تھی وہ آپ پر کوئی دعویٰ کرنے والا ہے۔“ وہ کچھ ڈرتے ڈرتے بولی۔

”وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بس آپ مطمئن سے ہو جائیں۔“ انہوں نے بہت یقین سے

کہا۔ پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔

”چلئے! تیار ہو جائیں۔ میں آپ کو ابا جی کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ آپ اطمینان سے

کچھ دن وہاں رہیں۔ جب واپس آئیں گی تو انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔“

وہ ممنون نظروں سے انہیں دیکھتی ہوئی اپنے کمرے میں تھ گئی اور بیگ نکال کر اس میں

اپنے کپڑے رکھنے لگی۔

☆☆☆

شادی کے بعد وہ اماں کے گھر آتی تو رہی تھی لیکن کچھ دن رہنے کی غرض سے پہلی بار

آئی تھی اور سب سے زیادہ خوش فہمی تھی کیونکہ اس کے جانے سے وہ بالکل اکیلی ہو گئی تھی۔ بار بار

اُس کے گلے میں بازو ڈال کر کہتی۔

”ایمان سے سچی! میں تو دیواروں سے باتیں کر کر کے اُکستا گئی ہوں۔“

”یہی حال میرا بھی ہے۔“ اُس کے منہ سے بنا سوچے نکل گیا۔ پھر اماں کو دیکھ کر

خاموش ہو گئی۔

”تم بھی.....؟“ می نے بات سنبھالنے کی غرض سے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

”کیا ابتسام بھائی گونگے ہیں؟“

”اللہ نہ کرے۔“ وہ مسکرائی۔ ”اب سارا دن تو وہ گھر پر نہیں ہوتے ناں! صبح کے گھر

سے گئے شام کو آتے ہیں۔“

”کوئی پرابلم ہے؟“ وہ براہ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔
 ”نہیں!“ نہیں کی صورت گہری سانس لی۔ پھر اُن کے پیچھے نظریں دوڑاتے ہوئے
 بولی۔ ”پتہ نہیں فہمی کہاں رہ گئی۔ ٹھہریے میں دیکھتی ہوں۔“ وہ کچن سے نکلنے لگی کہ وہ دروازے میں
 راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ گو کہ قصداً دیوار بنے تھے لیکن جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے
 انجان بن کر بولے۔

”یہاں ماچس ہوگی؟“

”ہاں!“ وہ فوراً پٹی اور ریک پر سے ماچس اٹھا کر ان کی طرف بڑھادی۔ جسے لے کر
 انہوں نے سگریٹ سلگایا۔ پھر اُس کی طرف دیکھ کر بولے۔
 ”اگر آپ یہاں کبھی اسی طرح پریشان رہیں تو مجبوراً مجھے اسی وقت آپ کو گھر لے کر
 جانا پڑے گا۔“

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی بلکہ اُن سے پوچھنا چاہتی تھی کہ انہوں نے اس سلسلے میں کیا کیا کہ
 فہمی کے آنے سے خاموش ہو رہی۔ اور وہ فہمی کو دیکھ کر بولے۔

”چلیں؟“

”جی!“ فہمی نے انہیں راستہ دیا۔ پھر اُس کے ساتھ چلنے لگی۔

”کب تک آؤ گی؟“ برآمدے میں اماں انہیں روک کر پوچھنے لگیں۔

”جانے تو دیں اماں! واپس بھی آجائیں گے۔“ اس سے پہلے فہمی بول پڑی۔ اور اماں
 کے گھورنے پر ہنسی ہوئی اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

”ہاں بھی فہمیدہ خانم.....! آپ بتائیں کہاں چلیں گی؟“ انہوں نے گاڑی اشارت
 کرتے ہوئے پوچھا تو فہمی منہ بنا کر بولی۔

”مجھ سے نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔“

”کیوں بھی؟“

اپنے بھائی کی طرح نکلی۔ تب ابتسام کہنے لگے۔ اب وہ خود دیکھ لیں گے دیکھو کیا کرتے ہیں۔“
 ”ندا ایسی لگتی تو نہیں تھی۔ اور مجھے تو لگتا ہے اُس نے شروع ہی سے تمہارے خلاف
 کوئی سازش کر رکھی تھی۔“

”پتہ نہیں۔“ پھر اماں کو آتے دیکھ کر فہمی کو اشارہ کرتے ہوئے موضوع بدل دیا۔
 اگلے دن شام میں ابتسام آئے۔ کچھ دیر باجی کے پاس بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے
 رہے۔ وہ چائے لے کر گئی تو اُس سے کہنے لگے۔

”کہیں آؤنگ کے لیے چلیں گی؟“ وہ ابھی جواب نہیں دے پائی تھی کہ کہنے لگے۔
 ”میں چائے پی لوں پھر چلتے ہیں۔ فہمی کو بھی ساتھ لے لیجئے گا۔“ وہ اجازت طلب
 نظروں سے باجی کی طرف دیکھنے لگی تو غالباً انہیں ابتسام کی وجہ سے کہنا پڑا۔

”ہاں ہاں! لے جاؤ فہمی کو بھی۔“ اُس نے کچن میں آ کر فہمی کو بتایا تو وہ اُچھل پڑی۔
 ”سچ کہہ رہی ہو؟“

”ہاں!“

”ایک بار پھر پوچھ آؤ۔ میرا خیال ہے تمہارے سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔“
 ”پاگل مت بنو!“ وہ خواہ مخواہ چڑ گئی۔ ”چلنا ہے تو چلو..... ورنہ صاف منع کر دو۔“
 ”ارے واہ! میں کیوں منع کروں گی۔ زندگی میں پہلی بار تو باجی مہربان ہوئے ہیں۔“
 فہمی فوراً تیار ہونے چلی گئی۔

”ایک بار مجھ پر بھی مہربان ہوئے تھے۔“ اس نے سوچا اور اُسے ندا کی شادی یاد آئی۔
 پھر جو کچھ اُس کے ساتھ ہوا تھا۔

”کیا بات ہے..... چلنا نہیں ہے؟“ وہ ابھی تک اُسی دن کو سوچ رہی تھی کہ ابتسام کی
 آواز پر چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ کیونکہ ذہن ابھی تک اُسی واقعہ کی گرفت میں تھا۔ اس لیے بے
 خیالی میں اُن پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔

وہ پورا ایک ہفتہ اماں کے گھر رہی۔ ابتسام روزانہ شام میں کچھ دیر کے لیے آ جاتے تھے۔ پھر ہفتے بعد انہوں نے ہی اُسے چلنے کے لیے کہا۔ اُس کے پاس مزید کسے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ اس لیے اُن کے ساتھ چلی آئی۔ یہاں وہی بور کر دینے والے دن تھے۔ سارا دن وہ یونہی ادھر سے ادھر چکراتی رہتی۔ کوئی کام کرنے کی کوشش بھی کرتی تو دل نہیں لگتا تھا۔ ایک دو بار ندا کا فون آیا اور وہ اس سے بھی کچھ ایسی خفا تھی کہ اُس کی آواز سننے ہی فون بند کر دیتی۔ اُس کے اندر عجیب سی بے کلی سما گئی تھی۔

وہ ناشتے کی ٹیبل پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ابتسام فون پر پتہ نہیں کس سے بات کر رہے تھے۔ وہ گا ہے بگا ہے ان پر نظر ڈال لیتی۔ غالباً انتظار میں تھی کہ وہ آئیں تو ناشتہ شروع کرے۔ اور جب وہ آئے تو کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہی کہنے لگے۔
 ”بھئی صبح ہی صبح بہت اچھی خبر سننے کو ملی۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو کہنے لگے۔

”مابدولت ماموں جان بن گئے ہیں۔“

”اچھا! کیا ہوا ہے؟“ وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

”بیٹا!“

”اور بے بی کیسی ہے؟“ وہ ندا کو بے بی کہتے تھے۔

”ٹھیک ہے اور اب انشاء اللہ وہ ایک ڈیڑھ مہینے تک یہاں آئے گی تو آپ کی ساری

بوریت دور ہو جائے گی۔ بہت باتونی ہے وہ۔“

”اچھا!“ وہ گھر میں اُس کی آمد کا تصور کر کے ہی خوش ہو گئی۔ پھر اُن کے آفس جانے

کے بعد اُسی وقت سے وہ اُس کے لیے کمرہ ٹھیک ٹھاک کرنے میں لگ گئی۔ گو کہ ابھی اُسے آنے میں کافی دن تھے لیکن یہ مصروفیت اُسے اچھی لگ رہی تھی۔ اس لیے بہت دیر تک وہ اس کام میں مصروف رہی۔ درمیان میں کسی کسی وقت کچن میں بھی جھانک آتی تھی۔

”اس لیے کہ میرے لیے تو ہر جگہ ہی نئی ہے جہاں بھی لے چلیں گے۔“

”یہ ایسی ہی باتیں کرے گی۔“ وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔
 ”بس کہیں بھی چلیں۔“

”ہو سکتا ہے جہاں میں لے چلوں وہاں آپ دونوں بور ہوں۔“

”بے فکر رہیں۔ ہم کہیں بھی بور نہیں ہوں گے۔“ فہمی نے پھر بولنا ضروری سمجھا تو وہ ایک نظر اس پر ڈال کر سامنے متوجہ ہو گئے۔

پھر شام کا وقت انہوں نے ساحل کی گیلی ریت پر چہل قدمی کرتے گزارا۔ نئی لہروں کا تعاقب کرتے ہوئے آگے تک چلی گئی تھی۔ اس دوران انہوں نے اُسے بتایا کہ آج انہوں نے ایک وکیل سے مشورہ کیا تھا۔ اور اس کے کہنے پر ہی اُس کی طرف سے خلع کا نوٹس ندا کے بھائی کو بھجوا دیا گیا ہے۔ پھر انہوں نے اُسے اطمینان دلایا کہ جلد ہی یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور وہ کسی حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔ پھر واپسی میں انہوں نے چائینز میں کھانا کھایا۔ اور تقریباً دس بجے کے بعد گھر آئے تھے۔

اُن کا خیال تھا ان دونوں کو چھوڑتے ہی چلے جائیں گے لیکن فہمی نے انہیں چائے کے لیے روک لیا۔ اور اس وقت انہوں نے چائے اماں کے ساتھ بیٹھ کر پی۔ اماں کی باتیں خالص گھریلو قسم کی تھیں۔ جن میں زیادہ تر تذکرہ فہمی کی شادی کا تھا۔

ڈھکے چھپے الفاظ میں وہ ایک طرح سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھیں کہ ابتسام جیسا رشتہ فہمی کے لیے بھی مل جاتا تو وہ اس فرض سے بھی سبکدوش ہو جاتیں۔ ابتسام خاصے سعادت مند بنے توجہ سے اُن کی باتیں سن رہے تھے۔ جبکہ وہ اپنی جگہ پہلو بدلتے ہوئے خاصی جزیر ہو رہی تھی کیونکہ اس کے خیال میں ابتسام کے سامنے ایسی باتیں فی الحال مناسب نہیں تھیں۔ فہمی چائے لے کر آئی تب اُس نے شکر کیا کیونکہ اس کے آنے سے اماں نے موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

☆☆☆

دو پہر تک وہ کمرے کو پوری طرح سیٹ کر کے فارغ ہو گئی۔ پھر شور لے کر اُس کے بعد کھانا کھایا۔ اور کچھ دیر سونے کی غرض سے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ فون کی بیل سن کر لابی میں آ گئی۔

”ہیلو! ریسیور کان سے لگاتے ہی اُس نے ہیلو کہا تو دوسری طرف ابتسام غالباً اُسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھے۔ اُسی پرانے لہجے میں آواز بدل کر بولے۔

”بھئی آپ جتنے مرضی دعوے کر لیں میں اپنا حق ثابت کر کے دکھاؤں گا۔“

”تم.....!“ وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گئی۔ ”تمہیں جرات کیسے ہوئی مجھے فون کرنے کی اور یہ تم نے میرا نمبر کہاں سے لیا ہے؟“

”نمبر.....!“ وہ ہنسا۔ ”آپ کے شو ہر نامدار نے خود مجھے نمبر دیا ہے تاکہ میں آپ کو رام کر سکوں۔“

”کیا؟“ وہ چیخی۔

”جی ہاں!“ وہ اطمینان سے بولا۔ اصل میں ابتسام صاحب آپ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔“

”ابتسام!“ وہ اس کی بات پر سناٹے میں آ گئی۔

”جی! بیچارے شریف آدمی ہیں۔ اپنے منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ اس لیے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو اپنے حق میں ہموار کر لوں تاکہ اُن کی جان چھوٹے۔“ وہ کوشش کے باوجود ایک لفظ نہیں بول سکی۔

”پھر کیا خیال ہے..... کسی دن آ جاؤں؟“ اُسے اپنا آپ انتہائی ہلکا لگا۔ آنکھیں ایک پل میں جل تھل ہو کر برسنے لگی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا۔

”یقین کریں..... میں اتنا برا نہیں ہوں جتنا آپ نے سمجھ لیا ہے۔ معاشرے میں میرا ایک مقام ہے۔ میں آپ کو اچھی زندگی دے سکتا ہوں۔“ اُس نے اپنے آپ کو بولنے سے معذور

فسوس کیا تو ریسیور رکھ دیا۔ اور ابھی وہیں کھڑی تھی کہ دوبارہ بیل بجنے لگی۔ وہ یہی سمجھی اُسی کا ہوگا اس لیے وہاں سے ہٹ آئی۔ اور ابھی اپنے کمرے میں داخل ہو رہی تھی کہ پیچھے سے کرم دین کاگتا ہوا آیا۔

”بی بی! صاحب کا فون ہے۔“ وہ انہی قدموں واپس پلٹ آئی۔ ریسیور اٹھایا تو اپنی بے بسی پر اور شدت سے رونے آیا کیونکہ حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے جی کہہ سکی۔

”میں بہت دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں لیکن شاید فون بڑی تھا۔“ اُن کا انداز جتانے والا تھا۔ وہ عجیب مشکل میں گرفتار ہو گئی۔

”کیا آپ سو رہی تھیں؟“ وہ اُس کے خاموش رہنے پر پوچھنے لگے۔

”نہیں۔“

”اچھا تو ایسا ہے کہ آج ایک دوست کے ہاں ڈنر میں جانا ہے۔ آپ تیار رہیے گا۔“

”سوری!“ وہ منع کرنا چاہتی تھی اور اسی قدر کہہ سکی۔

”سوری.....؟“ انہوں نے دہرایا۔

”میرا مطلب ہے میں نہیں جاسکوں گی۔“

”کیوں؟“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہوا ہے؟“ وہ تشویش سے پوچھنے لگے اور اُس کے ذہن پر ابھی کچھ دیر پہلے کی باتیں دستک دینے لگیں۔

”ابتسام آپ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔“

”ہیلو جی!“ وہ پکار رہے تھے اور وہ فون بند کر کے اپنے کمرے میں آئی۔ اُس کی سمجھ

مجھے اپنے حق میں ہموار کر سکے اور یہ بھی کہ آپ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔“

”کیا؟“ انہوں نے حیرت کا مظاہرہ کیا اور وہ پردانہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”اگر ایسی بات ہے ابتسام احمد! تو آپ کو براہ راست مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔“

اُس لوفر آدمی کو کیوں میرے پیچھے لگا دیا؟“

”میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ میری تو کبھی اُس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“ اُس کے بدلے تیار دیکھ کر انہیں اپنی صفائی پیش کرنی پڑی۔

”ہو سکتا ہے آپ سچ کہہ رہے ہوں۔ پھر بھی اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“ اس نے بڑے آرام سے اپنا فیصلہ سنا دیا جبکہ وہ ٹپٹا گئے۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”میں صرف اباجی کے ڈر سے کٹھ پتلی بنی رہی۔ حالانکہ مجھے اسی روز انہیں ساری بات بتا دینی چاہیے تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ وہ ڈانٹتے۔ اس کے بعد یہ صرف میرا مسئلہ تو نہ رہتا۔ اباجی جو مناسب سمجھتے..... کرتے۔ اور اب میں نے یہی سوچا ہے کہ میں اماں اور اباجی کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان حالات میں وہ میرا یہاں رہنا پسند نہیں کریں گے۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کریں۔“ اُن کا الجھنا فطری امر تھا۔ ”اب جبکہ حالات ٹھیک ہونے جا رہے ہیں تو آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔“

”مجھے حالات کسی طرح بھی ٹھیک ہوتے نظر نہیں آ رہے۔“

”آپ کو کیا پتہ؟“

”اب اتنی نادان بھی نہیں ہوں میں۔ بس آپ مجھے جانے دیں۔“

”میں پھر وہی کہوں گا کہ اگر یونہی کچھ دنوں کے لیے جانا چاہتی ہیں تو ضرور جائیں لیکن.....“

میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کبھی ابتسام کے رویے کو سوچتی اور کبھی اُس کی باتوں کو..... پتہ نہیں صداقت کہاں تھی۔

جتنے اطمینان اور ٹھوس لہجے میں وہ باتیں کر رہا تھا اس سے وہ اس کی باتوں کو نظر انداز بھی نہیں کر پارہی تھی۔ پھر اُس کے بعد ابتسام کے سابقہ رویے میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ الجھنے لگی۔

”انہوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اگر وہ مجھے چھوڑ دیں گے تو میں ندا کے بھائی سے سمجھوتا کر لوں گی۔ ہرگز نہیں! وہ کون ہوتے ہیں میرے بارے میں اپنا فیصلہ کرنے والے.....؟ میں خود سوچ سکتی ہوں۔“ اور پھر وہ ایک نئے انداز سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

”آپ نے میری طرف سے خلع کا جو دعویٰ دائر کیا ہے اس کا فیصلہ کب تک ہوگا؟“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں پوچھ رہی تھی کہ انہوں نے حیران ہو کر اُسے دیکھا۔ پھر بظاہر سرسری انداز میں بولے۔

”ایک آدھ مہینہ لگ جائے گا۔“ پھر اُسے سوچتے دیکھ کر پوچھنے بغیر نہیں رہ سکے۔

”کیوں؟“

”اصل میں ندا کے بھائی کا فون آیا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ میں جتنے مرضی دعوے کر لوں وہ اپنا حق ثابت کر کے رہے گا۔“

”اچھا!“ وہ خواہ مخواہ منے۔ اور وہ کچھ دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس لیے پوچھنے لگی۔

”ندا کے بھائی کو یہاں کا نمبر آپ نے دیا ہے؟“

”نہیں“ وہ دل ہی دل میں محظوظ ہوئے۔

”لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ آپ ہی نے اُسے مجھ سے بات کرنے کے لیے کہا ہے تاکہ وہ

تہ بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ بے اختیار ان کے گلے لگ گئی۔

”تم تو راستہ ہی بھول گئی ہو۔“ اماں بیٹھتے ہی شکوہ کرنے لگیں۔

”نہیں اماں! پچھلے دنوں کچھ طبیعت خراب رہی اور آج کل ابتسام مصروف ہیں۔“

”ہاں! کچھ کمزور بھی لگ رہی ہو۔“ اماں نے بغور اسے دیکھا۔ پھر رازداری سے

نے لگیں۔ ”نئے مہمان کے آثار تو نہیں؟“

”نہیں۔“ وہ جھینپ گئی۔

”اللہ کی دین ہے۔ میں تو ہر وقت دعا کرتی ہوں۔“ اماں اپنی کہے گئیں۔

”فہمی کو بھی لے آئیں۔“ اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔

”میں خود ہی نہیں لائی۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ بولتی بہت ہے اور مجھے تم سے بات کرنی تھی۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“ وہ اچنبھے سے پوچھنے لگی۔

”فہمی کے لیے ایک دو جگہ سے پیغام آئے ہیں۔ اسی سلسلے میں تمہارے ابا جی نے کہا تم

بھی مشورہ کر لوں۔“

”کون لوگ ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ پھر اچانک خیال آیا تو اٹھتے ہوئے بولی۔

”ٹھہریے! پہلے میں چائے کا کہہ آؤں۔ پھر بات کرتے ہیں۔“

”چائے رہنے دو۔“ اماں نے روکا لیکن وہ چلی گئی۔ پھر واپس آ کر ان کے برابر بیٹھیں تو

ہلکی۔

”ہاں! اب بتائیے کون لوگ ہیں؟“

”ایک تو اپنے ہی رشتے داروں میں سے ہے تمہاری چھوٹی ممانی کا بھائی ہے۔ اور

رے غیر ہیں۔“ اماں نے بتایا۔ پھر کہنے لگی۔

”نہیں میں یونہی نہیں جاؤں گی۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”پھر؟“

”میں نے طے کر لیا ہے کہ اب میرا مسئلہ ابا جی ہی حل کریں گے۔ اس کے بعد اپنے

بارے میں فیصلہ میں خود کروں گی۔“ وہ جتنی انداز میں بولی تو وہ کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتے

رہے۔ اصل میں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس کے ارادے سے کیسے باز رکھیں۔ پھر سوچ کر

بولے۔

”سنجیدہ خانم! اب یہ صرف آپ کا مسئلہ نہیں رہا۔ آپ جو ابا جی سے بات کرنے کا کہہ

رہی ہیں تو یہ بھی سوچا ہے کہ اس کے بعد میری پوزیشن کتنی آکھڑا ہو جائے گی!

کیا یہ سوال نہیں اٹھے گا کہ میں نے کس حیثیت سے آپ کو اپنے گھر میں رکھا؟

آئی ایم سوری خاتون! میں ان باتوں کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔“

”پھر میں کیا کروں؟“ وہ زچ ہو کر بولی۔

”بس کچھ دن انتظار کریں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ خفگی بھرا انداز لیے اٹھ کر اپنے

کمرے میں چلے گئے تو وہ اس وقت کو کوٹنے لگی جب ندا کی شادی میں گئی تھی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس دن کے بعد سے ابتسام کچھ اکھڑے

اکھڑے سے رہنے لگے تھے۔ بات بھی ضرورت کے تحت کرتے، بلکہ جب تک گھر میں ہوتے

زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتے تھے۔ بس صبح ناشتے پر ہی باقاعدگی سے سامنا ہوا تھا۔ رات کا

کھانا یا تو کھا کر آتے یا اگر جلدی بھی آجاتے تو منع کر دیتے تھے۔

یہ صورت حال اسے اور پریشان کر رہی تھی کیونکہ اس گھر میں اپنا وجود بے معنی سا لگنے

لگا تھا۔ کسی کسی وقت اس کا دل چاہتا وہ پپ چا پ یہاں سے نکل کر کسی ایسی جگہ چلی جائے جہاں

کبھی کوئی اس حد تک نہ پہنچ سکے۔ انہی پریشان سوچوں میں گھر کر وہ بھول ہی گئی کہ اماں کے گھر

گئے ہوئے کتنے بہت سارے دن ہو گئے ہیں اور اس روز اماں خود چلی آئیں۔ انہیں دیکھ کر اسے

”بس یہ ذکر کردوں گی کہ فہمی کے لیے رشتے آئے ہوئے ہیں۔ پھر دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔“

”ہاں! اگر اُس کی نظر میں کوئی ہوگا تو بتا ہی دے گا۔“ اماں خود ہی پر سوچ انداز میں بولیں۔ پھر خیال آیا تو پوچھنے لگیں۔

”تمہاری نند جو آنے والی تھی؟“

”ہاں! بیٹا ہوا ہے ناں اُس کا۔ میرا خیال ہے سوامہینہ کر کے آئے گی۔ ویسے سوامہینہ ہونے والا ہے۔ دیکھیں کب آتی ہے؟“

”چلو تمہارے گھر میں کچھ رونق ہو جائے گی۔“

”ہاں اماں! میں خود اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔“ وہ اشتیاق سے بولی۔

”اچھا! اب پھر میں چلوں۔“

”اتنی جلدی کیا ہے۔ شام میں ابتسام آئیں گے تو آپ کو چھوڑ آئیں گے۔“

”نا بیٹا! پھر تو بہت دیر ہو جائے گی۔ فہمی بھی گھر میں اکیلی ہے۔“ اماں اس کی بات سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اچھا کچھ دیر تو اور بیٹھیں!“

”بس اب تم آنا۔ فہمی بھی بہت کہہ رہی تھی، اتنے دنوں سے تم نہیں آئی۔“

”آؤں گی۔“

وہ اُن کے ساتھ چلتی ہوئی باہر تک آئی۔ پھر چوکیدار سے کہہ کر اُن کے لیے رکشہ منگوا دیا اور اُن کے جانے کے بعد اندر آئی تو فطری طور پر فہمی کے بارے میں سوچنے لگی۔ ابھی ان سوچوں سے نکل نہیں تھی کہ لاؤنج سے کچھ شور کی آواز آنے لگی۔ وہ پہلے چونکی، پھر سننے کی کوشش کرنے لگی۔

جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو کمرے سے نکل آئی۔ ابتسام چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے آرہے تھے اور ان کے پیچھے نندا کو دیکھ کر وہیں رُک گئی۔ اور کیونکہ فوری طور پر ذہن اس صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھا اس لیے اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔

”رشتے تو دونوں اچھے ہیں لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا؟“ ان کے خاموش ہونے پر اُسے پوچھنا پڑا۔

”بس سفید پوش لوگ ہیں اور میں سوچتی ہوں لوگ کیا کہیں گے کہ ایک بیٹی کو تو اچھے

خامسے گھر میں دیا اور دوسری کو۔۔۔۔۔“

”بات تو آپ کی ٹھیک ہے اماں! لیکن یہ تو سب مقدر کے کھیل ہیں۔ سب کو ایک جیسا

تو نہیں ملتا۔ اور یہ ضروری تو نہیں ہے کہ بڑے گھر میں آدمی ہنسی خوشی راج ہی کرے۔ مجھے دیکھیں

اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ سارا دن کوئی بات کرنے والا نہیں ہوتا۔“

”تو خوش تو ہے ناں!“ اماں کو فوراً فکر لاحق ہوئی۔

”خوش ہوں بھی اور نہیں بھی۔“ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اگر یہی گھر بھرا ہوا

ہوتا تو اچھا لگتا۔“

”اللہ تمہاری گود بھرے گا تو گھر بھی بھر دے گا۔“

وہ نہ ہاں کہہ سکی نہ ناں اور غنیمت کہ ملازم لوازمات کے ساتھ چائے لے کر آ گیا تو وہ

ادھر متوجہ ہو گئی۔

”یہ سمو سے لیجئے اماں!“ اُس نے فیمل اماں کے سامنے کھینچ دی۔ پھر کہنے لگی۔

”بہر حال اگر آپ کا دل نہیں مانتا تو انتظار کریں۔ ہو سکتا ہے کوئی اور اچھا رشتہ مل

جائے۔“

”لیکن تمہارے ابا جی اس بات کو نہیں مانتے۔ کہتے ہیں ضروری نہیں ہے فہمی کا نصیب

بھی جیسا ہو۔ اُن کا کہنا ہے لڑکا شریف ہو اور کھاتا کھاتا ہو بس۔۔۔۔۔!“

”پھر اب میں کیا کہوں؟“ وہ ابا جی کی بات سے بھی اختلاف نہیں کر سکتی تھی۔

”تم ابتسام سے ذکر کر کے دیکھو۔ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔؟“

”میں خاص طور سے نہیں کہوں گی اماں!“ وہ اُن کی پوری بات سننے بغیر بول پڑی۔

”ارے!“ وہ دونوں بہن بھائی اُس کے پیچھے لپکے۔ پھر کتنی دیر تک دروازے پر دستک دینے کے ساتھ اُسے پکارتے رہے لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا اور نیکیے میں منہ چھپا کر روتی رہی۔

دوپہر ڈھلی پھر شام..... وہ اسی طرح کمرے میں بند تھی۔ کبھی شدت سے رونے لگتی در کسی وقت روتے روتے نیند آ جاتی۔ آنکھ کھلتی تو پہلے وحشت سے چاروں طرف دیکھنے لگتی۔ پھر نیکیے میں منہ چھپا لیتی۔ اُسے بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ ساتھ میں دونوں بہن بھائی..... پر غصہ بھی تھا کہ وہ اس تمام عرصے میں کتنی پریشان رہی اور وہ دونوں خاص کر ابتسام اس کا تماشا دیکھتے رہے۔ بلکہ ٹیلی فون پر دوسرا روپ دھار کر ڈراتے بھی رہے تھے۔

”میں اب بالکل بھی یہاں نہیں رہوں گی۔“ سوچتے سوچتے وہ آخر میں یہ جملہ ضرور بہرائی۔ اس وقت بھی وہ یہی کہہ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اُس نے نیکیے میں سے سر نکال کر دیکھنا چاہا لیکن کمرہ مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

”سنجیدہ پلیز دروازہ کھولیں۔“ ابتسام کی آواز تھی۔ وہ دوبارہ نیکیے میں سر دینا چاہتی تھی کہ وہ کہنے لگے۔

”اگر آپ نے اب بھی دروازہ نہ کھولا تو مجھے مجبوراً اسے توڑنا پڑے گا۔“ وہ بہت آہستگی سے اُنھی اور لاک کھول کر دوبارہ مسہری پر آ بیٹھی۔ انہوں نے لاک کھولنے کی آواز سن لی تھی۔ کچھ لمحے انتظار کیا۔ پھر خود ہی اندر آ گئے۔ اندھیرے کے باعث وہ فوراً نظر نہیں آئی۔ تب انہوں نے لائٹ جلا کر دیکھا وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی۔ شدت گریہ سے آنکھیں سُرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ انہیں بے حد افسوس ہوا۔ قریب آتے ہوئے بولے۔

”تمہاری فحش بجا..... لیکن ہماری بھی تو سُنو۔“ وہ کچھ نہیں بولی۔

”میں جانتا ہوں اس تمام عرصے میں تم بہت پریشان رہی ہو۔ اور بخدا میں پہلے ہی مرحلے پر تمہاری پریشانی دور کرنا چاہتا تھا لیکن تمہارے منہ سے اپنے لیے نفرت انگیز کلمات سُن

”جی!“ اس پر نظر پڑتے ہی ندا خوشی سے بھرپور آواز میں چیخی اور بھاگ کر اس سے لپٹنا چاہتی تھی کہ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”ارے کیا تمہیں میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟“ ندا نے حیرت کا مظاہرہ کیا اور وہ بے چینی اور سنجیدگی سے بولی۔

”نہیں۔“

”کمال ہے میں تو تم سے ملنے کے لیے مری جا رہی تھی۔“

”کیوں؟“ وہ اب بھی انجان تھی۔

”اس لیے کہ تم میرے عزیز از جان بھائی جان کی منظور نظر ہو۔ میری بھابھی اور پتہ

ہے.....؟“

”پلیز!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ پھر ابتسام کی طرف اس انداز سے متوجہ ہوئی جیسے انہیں ندا سے متعارف کروانا چاہتی ہو لیکن انہیں بچے میں مصروف دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

پھر تصدیق کے لیے ندا کی طرف دیکھا تو وہ کندھے اُچکا کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ

بولی۔

”سوری! بھائی جان نے تمہیں جگ کیا۔ حالانکہ ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔“

”تم!“ پھر اُن کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”آپ.....“

”جناب!“ وہ کھل کر مسکرائے۔ پھر بچے کو ندا کی گود میں دیتے ہوئے بولے۔

”یقین کریں ہمارا مقصد آپ کو تنگ کرنا ہرگز نہیں تھا بلکہ میں تو اگلے روز ہی آپ کو بتانا

چاہتا تھا کہ.....“

وہ اُن کی پوری بات سُنے بغیر بھاگ کر کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر

لیا۔ شاید وہ مئی طرح ہرٹ ہوئی تھی۔

اُن کی آواز کی شوخی نے سچ سچ اُس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھیر دیے تھے
وہ تو دلچسپی سے دیکھ ہی رہے تھے 'نہا بھی بھاگی چلی آئی۔'

☆☆☆

کر میں نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ویسے اس میں تھوڑی سی میری خود غرضی کا بھی دخل ہے
کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میرے سامنے بھی نفرت کا اظہار کرو۔ اس لیے میں نے اپنا آپ
عیاں نہیں کیا۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”اور تھوڑا قصور تمہارا بھی ہے کیونکہ تم نے کبھی میری بات سہولت سے سننے کی کوشش ہی
نہیں۔ بس تمہاری ایک ہی ضد تھی مجھے طلاق دو۔ اور یہ میرے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن بات
تھی۔ اس لیے کہ نکاح کے بندھن میں بندھتے ہی تم میرے لیے جان سے بڑھ کر ہو گئی تھیں۔“
وہ جو انتہائی ناگواری سے اُن کی باتیں سن رہی تھی۔ آخری بات پر دل تو زور سے
دھڑکا ہی، آنکھیں بھی چٹلک پڑی تھیں۔

”پلیز روؤ مت! میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا۔ فیصلے کا اختیار اب بھی تمہیں ہے۔“
”کیسا فیصلہ؟“ وہ براہ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھ کر تنکھے لہجے میں بولی۔

”بھئی اگر تم مجھے مجرم سمجھتی ہو تب بھی مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا حق تو تھا اور میں
نے کہہ دیا۔ اب تمہاری مرضی..... معاف کر دو یا سزا دو۔“

وہ ابھی تک اُن پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اپنی بات کے اختتام پر انہوں نے سر اس
کے سامنے جھکا دیا تو وہ گردن موڑتے ہوئے بولی۔

”آپ بہت خراب ہیں۔“

”شکریہ۔“

وہ سراو نچا کرتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ اور اُس کا چہرہ اپنی طرف موڑنا چاہتے تھے
کہ ندا کی آواز پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ وہ دروازے میں سے جھانک کر پوچھ رہی تھی۔

”بھائی! کیا صورت حال ہے؟“

”جل تھل کے بعد کاساں ہے۔ قوس قزح کے رنگ دیکھنا چاہو تو آ جاؤ۔“

یہ بہاروں کی شام



سردیوں میں شام بہت جلدی ڈھل جاتی ہے اور مغرب کی نماز پڑھ کر بیٹھو کہ کچھ ہی دیر میں عشاء کی اذان ہونے لگتی ہے اور اس کے بعد تو لگتا ہے جیسے بہت رات بیت گئی ہو۔ کئی دنوں سے وہ سوچ رہی تھی اپنا ادھ سلا سوٹ مکمل کر لے اور آج صبح تو اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ یہ کام ضرور کر گزرے گی۔ لیکن چھوٹا سادہ گزرتے پتا بھی نہیں چلا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے صرف جھاز پونچھ ہی کی تھی کہ پتا چلا امی دوپہر کے کھانے کی فکر کر رہی ہیں اور اسے یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ امی کچن میں سرکھپاتی رہیں۔

وہ اپنا کام چھوڑ کر ان کے ساتھ کچن میں لگ گئی۔ دوپہر میں کچھ دیر کے لئے سونا بھی ضروری تھا۔ لہذا کھانا کھاتے ہی لیٹ گئی۔ گو کہ بار بار یہ جملہ دہراتی رہی تھی کہ بس ابھی اٹھ جاتی ہوں لیکن جب ساتھ والے بیڈ پر اساء کو بے خبری کی نیند سوتے دیکھا تو اس کا دل بھی بے ایمان ہو گیا۔

”کوئی اتنی زیادہ سلائی تو باقی نہیں ہے۔ سوکرائیوں گی تو مکمل کر لوں گی۔“ اپنے آپ

کو اس طرح بہلاتے ہوئے کبل میں منہ چھپالیا تھا۔

پھر اسماء نے ہی اسے اٹھا کر چائے کا کپ تھمانے کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی تھی کہ اس کی ساس اور نندیں آئی ہوئی ہیں۔

”ہونے والی۔“ اس نے اسماء کو گھورتے ہوئے تصحیح کی تھی۔ پھر شام کا وقت اس طرح گزر گیا اور اب عشاء کی نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ اسماء کے ساتھ لحاف میں دبک گئی۔ ابو جی آج صبح ہی آفس کے کسی کام سے لاہور چلے گئے تھے۔ شوبی اور نومی ابھی ٹیوشن سنٹر سے نہیں لوٹے تھے۔ رات کا کھانا ان کے آنے پر ہی کھایا جاتا تھا۔

”زارا۔“ اسماء اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”مجھے لگتا ہے تمہارے سسرال والے شادی کی کوئی قریبی تاریخ رکھنا چاہتے ہیں۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”میں جب چائے دینے گئی تھی تو تمہاری ساس میرا مطلب ہے ہونے والی ساس کچھ اسی قسم کی گفتگو کر رہی تھیں اور ان کی بیٹیاں بھی خاصی پر جوش دکھائی دے رہی تھیں۔“

”امی نے کیا کہا؟“

”ظاہر ہے امی نے ساری بات ابو جی کے آنے پر ٹال دی۔ ویسے بھی ابو جی تین چار روز میں آ ہی جائیں گے۔“

”ہوں۔“ وہ ہوں کہہ کر جانے کس سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

”تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“ اسماء نے پوچھا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”بتاؤ ناں۔ خوشی کی بات تو ہے کہ اب اس گھر میں شادیاں نہ ہوں گے۔“

”ہاں لیکن پتا نہیں کیوں اسماء! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”کیوں؟“

”شاید اس لئے کہ بالکل انجانے لوگ ہیں۔ پتا نہیں ان کا ماحول کیسا ہو اور میں

ایڈ جسٹ بھی کر سکوں گی کہ نہیں۔“ وہ خاصی فکر مند نظر آ رہی تھی۔

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔“

اسماء کو کہ اس سے چھوٹی تھی پھر بھی اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

”شرور میں تھوڑی وقت ضرور ہوتی ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

دیے آذر بھائی بہت اچھے مزاج کے ہیں۔ میرا خیال ہے تم بہت جلد ان کے ماحول میں ایڈ جسٹ ہو جاؤ گی۔“

”کیا ان کے گھر کا ماحول بھی ہمارے گھر جیسا ہے؟“

”پتا نہیں۔“ اسماء نے کندھے اچکائے پھر کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے اتنا دقیقاً نوی نہیں ہوگا جیسا کہ ہمارا ہے۔“

”ہمارا دقیقاً نوی تو نہیں ہے۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”تو اور کیا ہے۔ بے چارے آذر بھائی میری خوشامد کر کے تھک گئے ہیں کہ تمہاری

ایک جھلک انہیں دکھا دوں۔ جھلک نہیں تو تصویر ہی لیکن امی نے اتنی سختی سے منع کر رکھا ہے کہ میری

ہمت ہی نہیں ہوگی اور ابو جی بھی اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔“

”تو اس سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ ہم دقیقاً نوی ہیں۔“

”کیوں آج کل تو متغنی کے بعد لڑکی اور لڑکا علی الاعلان ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔“

یہاں تک کہ شادی کی شاپنگ بھی دونوں مل کر ہی کرتے ہیں۔“

”کرتے ہوں گے لیکن.....“ اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔ شوبی ان کے کمرے

میں جھانک کر پوچھنے لگا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں“ اسماء نے کہا تو وہ اندر آتے ہوئے بولا۔

”خیر تو ہے۔ یہ آج تم دونوں نے اتنی جلدی بستر کیوں سنبھال لیا؟“

”سردی کی وجہ سے۔“

”ہاں سردی تو ہے۔“ وہ دونوں ہتھیلیاں آپس میں رگڑتا ہوا اسماء کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔
”کبیل اوڑھ لو۔“

”نہیں میرا خیال ہے پہلے کھانا کھالیا جائے۔“

”ارے ہاں میں گرم کرتی ہوں۔“ اسماء اٹھی ہی تھی کہ نومی بڑے پر جوش انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔

”ابھی ابھی بڑا زبردست پروگرام ذہن میں آیا ہے۔“ وہ آتے ہی بولا اور پھر تینوں کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہنے لگا۔

”ابو تو لاہور گئے ہوئے ہیں۔ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔“

”کیا مطلب۔“

”بھئی وی سی آر۔ اور دو تین فلمیں کرائے پر لے آتا ہوں۔“

”زبردست آئیڈیا لیکن امی منع کر دیں گی۔“

”امی کو منالیتے ہیں۔ تم اسماء جلدی سے کھانا گرم کرو۔ کھاتے ہی لے آؤں گا۔“

”پہلے امی کو راضی کرو۔“ وہ جاتے جاتے بولی۔

”امی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے تھوڑی سرزنش کریں گی پھر مان جائیں گی۔“

نومی ہنستے ہوئے بولا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ امی نے پہلے منع کیا۔ تھوڑا اذنا بھی پھر ان

کی خواہش کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ کھانے کے دوران انہوں نے فلموں کے نام تجویز کیے۔

پھر جب نومی اور شوبی وی سی آر لینے چلے گئے تو وہ دونوں لحاف اور کبیل لے کر ڈرائنگ روم میں

آگئیں۔ انہوں نے امی سے بھی کہا کہ وہ بھی ادھر ہی آجائیں لیکن امی کو کوئی دلچسپی نہیں تھی انہیں

کچھ ہدایات دے کر سونے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

”میرا خیال ہے چائے بنا کر تھرماں میں رکھ لیتی ہوں ورنہ نومی بار بار فلم دیکھتے میں

سے اٹھائے گا۔“

اسماء کو یاد آیا تو فوراً کچن کی طرف چلی گئی۔ پھر جب وہ چائے سے بھرا تھرماں اور مگ لے کر آئی تو نومی اور شوبی وی سی آر سیٹ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایسا موقع انہیں کبھی کبھی ہی ملتا تھا کیونکہ ابو جی وی سی آر کے سخت خلاف تھے۔ خاص طور پر انڈین فلمیں تو بالکل بھی نہیں دیکھنے دیتے تھے۔ ان چاروں کو بھی کوئی اتنا زیادہ شوق تو نہیں تھا بس کبھی کبھار دل چاہتا تھا کہ گھر بیٹھے کوئی ایسی تفریح جس میں آزادی سے انجوائے کیا جاسکے۔ اور فلم دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس پر جو وہ چاروں تبصرہ کیا کرتے تھے۔ اس سے وہ خاصا حظ اٹھایا کرتے تھے۔

”دیکھو۔ تین سال کا بچہ ہے۔ اسے جوان ہونے تک یاد رہے گا کہ اس مقام پر ولن

نے میرے ماں باپ کو مارا تھا۔“

”ایمان سے کیا زبردست یادداشت ہوتی ہے فلم والوں کی۔ مجھے تو آج کی بات یاد

نہیں رہتی۔“

”چپ کرو ناں۔“

اسماء نے ٹوکا۔ اسے فلم میں کچھ دلچسپی نظر آنے لگی تھی۔ سب کوئی وی سی آر کی طرف متوجہ

کیا۔ کچھ اس قسم کا سین تھا کہ لڑکی کے جہیز میں کچھ چیزوں کی کمی۔ لڑکے والوں کا پہلے مطالبہ پھر

بارات واپس لے جانے کی دھمکی۔ اس کے بعد دھمکی پر عمل بھی کر ڈالا۔ بارات واپس جا رہی تھی

لڑکی کی ماں تو اسی وقت تورا کر گر گئی اور باپ چوکھٹ سے سر ٹکرا رہا تھا۔

”کیا بکواس دکھا رہے ہیں۔“ زارا اکتا کر بولی۔

”ایسا بھی کہیں ہوتا ہے بھلا۔ بارات ہی تو واپس جا رہی ہے۔ کوئی سچ سچ قیامت تو

نہیں ٹوٹ پڑی۔ اب دیکھو اچھا بھلا آدمی چوکھٹ سے سر ٹکرا کر مر جائے گا۔ حقیقت سے دور کا

بھی واسطہ نہیں۔“

”زارا چپ کرو ناں۔“ اسماء نے پھر ٹوکا۔

”بھئی میں چپ نہیں رہ سکتی۔ مجھے تو بجائے افسوس ہونے کے ہنسی آرہی ہے۔“
 اس کے ساتھ ہی وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ ہنسی کے درمیان تبصرہ بھی جاری تھا۔
 ”سرگرا نے کی بجائے شکر ادا کرنا چاہئے کہ اسی وقت لڑکے والوں کی قلعی کھل گئی۔ اور
 لڑکی دیکھو۔ یوں بیٹھی ہے جیسے غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں۔“
 ”تو کیا تم اسے معمولی بات سمجھ رہی ہو؟“ شوبی نے گردن موڑ کر سنجیدگی سے اس سے
 پوچھا۔

”معمولی نہیں ہے تو ایسا بھی نہیں ہے کہ سارا خاندان ہی فوت ہو جائے سوائے ہیر دکن
 کے۔“

”یہ صدمہ بڑا گہرا ہوتا ہے زارا۔ تم اگر سنجیدگی سے سوچو تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

”میں نہیں مانتی۔ بس بند کرو اسے کوئی اچھی سی دوسری فلم لگاؤ۔“

”ہوں اچھی سی فلم۔ اس فلم پر تم ہنس رہی ہو اور کامیڈی فلم پر یقیناً روؤ گی۔“

”اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ جس طرح کی کامیڈی ہوتی ہے۔ اس پر ہنسنے کی بجائے

رونا آتا ہے۔ اور ٹریجڈی پر رونے کی بجائے ہنسی۔“

”کبھی تو تم ٹھیک ہو لیکن پلیز اب جبکہ ہم پیسے خرچ کر رہی ہیں تو جیسی بری بھلی

فلمیں ہیں دیکھ لینے دو۔“

نوی کی بات پر وہ واقعی سنجیدہ ہو گئی۔ پھر پوری رات انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے گزار

دی۔ کبھی خاموشی سے دیکھتے اور کبھی بہت ساری فلم ان کے تبصرے میں گزر جاتی۔

صبح جب امی نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو چاروں سوئے ہوئے نظر آئے۔ نوی

صوفے پر اور شوبی دیوان پر نظر آیا اور وہ دونوں نیچے سو رہی تھیں۔

”زارا! اسماء! امی نے ان کے منہ پر سے لحاف اٹھا کر آواز دی۔

”سو نا ہی ہے تو اپنے کمرے میں جا کر سو۔“

”اچھا امی!“ اسماء دوبارہ لحاف منہ پر ڈالنا چاہتی تھی کہ امی نے پورا لحاف کھینچ لیا۔

”کوئی مہمان آگیا تو کتنی پریشانی ہوگی۔ چلو اٹھو یہاں سے۔“

”صبح صبح کوئی نہیں آتا۔“

”بہر حال تم یہاں نہیں سوؤ گی۔“

امی نے زبردستی دونوں کو اٹھا کر ان کے کمرے میں بھیج دیا پھر شوبی اور نوی کو اٹھا لے

گئیں۔

☆☆☆

اسماء کا اندازہ درست نکلا۔ ابو جی جیسے ہی لاہور سے آئے۔ اس سے اگلے دن زارا کے

سرال والے شادی کی تاریخ لینے آ گئے۔ ابو جی اس کی شادی کرنا تو چاہتے تھے لیکن کوئی قریبی

تاریخ دینے سے قاصر تھے۔ کیونکہ ابھی چھ ماہ پہلے ہی اس کی منگنی ہوئی تھی اور اس دوران وہ پوری

تیاری بھی نہیں کر سکے تھے۔

ابو جی گورنمنٹ ملازم تھے اور عام لوگوں کا خیال تھا کہ جس کرسی پر وہ بیٹھے ہیں وہاں

اضافی آمدنی تنخواہ سے چار گناہ زیادہ ہوتی ہے۔ لوگوں کا خیال غلط بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اکثر لوگ

اضافی آمدنی کو جائز سمجھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے ہیں لیکن ابو جی حقیقتاً ایسے نہیں تھے۔

محنت اور حق حلال کی کمائی پر زندگی گزاری۔ اور بچوں کو بھی یہی درس دیتے تھے۔ وہ زندگی کے ہر

شعبے میں اپنے اصولوں کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ اپنا ذاتی گھر تک تو تھا نہیں ان کے پاس

جبکہ ان سے جو نیر کئی کئی پلاٹ بک کر دے بیٹھے تھے۔

بہر حال زارا کی شادی کے لئے وہ اس کے سرال والوں کو مزید چھ ماہ رکھنے کے لئے

کہہ رہے تھے لیکن ان لوگوں کو پتا نہیں کس بات کی جلدی تھی۔ ایک مہینے سے زیادہ بڑھنے کو تیار ہی

نہیں ہوئے۔ اتنا اصرار کیا کہ مجبوراً ابو جی کو ہامی بھرنی پڑی۔

یوں تاریخ طے ہوتے ہی گھر میں تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کیونکہ اس گھر میں پہلی

گانے کی آواز آرہی تھی تو وہ ٹھوڑی گھنٹوں پر لگائے کسی اور ہی دنیا میں نکل گئی تھی۔
 ”زارا۔“ اسماء نے دروازے سے جھانک کر اسے پکارا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”آذر بھائی کی والدہ اور بہنیں آئی ہیں۔ تم آ جاؤ تو ذرا جلدی سے چائے وغیرہ بنا لیں گے۔“

وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مثال اپنے گرد اچھی طرح لپیٹتی ہوئی اسماء کے ساتھ کچن میں آگئی۔ اسماء نے جلدی سے چولہا جلا کر چائے کا پانی رکھا اور وہ ٹرے میں کپ رکھنے لگی۔

”اس وقت کیسے آئے یہ لوگ؟“ وہ دھیمی آواز میں پوچھنے لگی۔
 ”پتا نہیں۔“ اسماء نے لاعلمی کا اظہار کیا ساتھ ہی بسکٹ کا پیکٹ اسکے ہاتھ میں تھما دیا جسے کھول کر وہ بسکٹ پلیٹ میں رکھنے لگی۔

”میرا خیال ہے مہمانوں کی تعداد وغیرہ کے بارے میں کوئی مشورہ کرنا ہوگا۔“
 اسماء قیاس کرتے ہوئے بولی۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا خاموشی سے ٹی پاٹ ٹرے میں رکھ کر اسماء کو جانے کا اشارہ کیا۔

”شکر یہ زارا۔“ اسماء نے کہا اور ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔
 وہ فوراً اپنے کمرے میں نہیں گئی۔ چولہا جلا کر یونہی اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ کمرے کے مقابلے میں کچن گرم تھا۔ اس لئے یہاں کھڑے ہونا اچھا لگ رہا تھا۔

کافی دیر بعد اسے خیال آیا کہ اگر کوئی اچانک ادھر آ جائے تو اسے اس طرح کھڑے دیکھ کر پتا نہیں کیا سوچے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے چولہا بند کیا اور کچن سے نکل آئی۔

ابو جی کے کمرے کے سامنے سے گزرنے لگی تو اندر سے آذر کی والدہ کے بولنے کی آواز آئی۔ ڈرائنگ روم میں لڑکیوں کی وجہ سے شاید وہ لوگ یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دبے

شادی تھی اس لئے امی خاصی بوکھلائی ہوئی تھیں۔ کپڑوں اور کراکری کی طرف سے انہیں کچھ اطمینان تھا کیونکہ یہ دونوں چیزیں شاید انہوں نے بیٹیوں کی پیدائش کے ساتھ ہی جمع کرنی شروع کر دی تھیں۔ لیکن جہیز میں دینے کے لئے یہی دو چیزیں تو کافی نہیں ہوتیں۔ اس لئے بقیہ سامان کے لئے خاصا تردد کرنا پڑ رہا تھا۔

ابو جی اپنی ایک عمر کی جمع پونجی اس شادی پر خرچ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسماء زارا سے صرف ایک سال چھوٹی ہے۔ اس لئے اس کے لئے بھی کچھ بچا کر رکھنا چاہئے۔ ان کی بات غلط بھی نہیں تھی لیکن امی بھی کیا کرتیں کہ کوئی نہ کوئی خرچ نکالا چلا آ رہا تھا۔ خرچ میں صرف دولہا کے کپڑوں کا حساب رکھا گیا تھا جبکہ بعد میں اس کے تمام گھر والوں کے لئے بھی کپڑے بنانے پڑے۔ اسی طرح ہر خرچ میں سے کوئی دوسرا خرچ نکلتا چلا گیا۔

وقت کو بھی جیسے پر لگ گئے تھے۔ اتنی جلدی دن گزرے کہ پتا بھی نہیں چلا۔ صرف پانچ دن رہ گئے تھے۔

اس وقت وہ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کی کزنز جنہیں آج ہی امی نے بلایا تھا کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر اسماء کے ساتھ ڈرائنگ روم میں چلی گئیں جہاں ان سب نے ڈھولک سنبھال لی تھی۔

چھ ماہ پہلے وہ آذر کے ساتھ منسوب کی گئی تھی اور کیونکہ اس کے گھر کا ماحول بہت روایتی قسم کا تھا۔ اس لئے آذر کے نام کی انگوٹھی پہنتے ہی وہ اپنا سب کچھ اسے ہی سمجھ بیٹھی تھی۔ حالانکہ اس نے آذر کو دیکھا تک نہیں تھا۔ بس سارا کمال اس انگوٹھی کا تھا جس نے انگلی کو گرفت میں لیتے ہی اس کی ساری سوچوں کو بھی گرفت میں لے لیا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے وہ ایک ان دیکھے شخص کو نہ صرف سوچ رہی تھی بلکہ اس کے حوالے سے کچھ خواب بھی سجا لئے تھے۔

اسماء شوبلی اور نومی سب ہی آذر کی بہت تعریف کرتے تھے اور ان کی تعریفوں سے ہی اس نے اپنے ذہن میں آذر کا خاکہ بنا لیا تھا۔ اس وقت جبکہ ڈرائنگ روم سے ڈھولک تالیوں اور

”پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟“ ابو جی ہار مان گئے۔
 ”چلیے۔ ہم وی سی آر چھوڑ دیتے ہیں لیکن باقی سارا سامان تو آپ کو دینا پڑے گا۔“
 وی سی آر چھوڑنے کا احسان کیا گیا۔

”فرنج۔ ٹی وی۔ واشنگ مشین۔ یہ ساری چیزیں دینا تو بہت مشکل ہے۔“
 ”مشکل ہے۔ ناممکن تو نہیں۔“
 ”مجھے تو ناممکن ہی لگ رہا ہے۔“

”اگر ناممکن ہے تو ہماری طرف سے بات ختم سمجھیں۔“ آذر کی والدہ شاید اپنے زعم میں کھڑی ہو گئی تھیں۔ اور امی کا منت بھرا لہجہ اس کی رگوں میں منجمد ہوتے لہو میں جیسے ایک دم سے آگ لگا گیا۔ امی انہیں روک رہی تھیں۔ بیٹھنے کا اصرار کر رہی تھیں۔

”امی۔ ابو جی۔“ اس کا دل چاہا وہیں سے چیخنا شروع کر دے اور کہے۔

”مت روکیں انہیں۔ جانے دیں“ لیکن بدستور زبان بند رکھی کہ وہ بولنے کا حق رکھتی تھی پھر بھی محروم تھی۔ بے دردی سے نچلے ہوٹ کو دانٹوں میں دبایا۔ دل میں اٹھتے طوفان کو دہانے کی کوشش میں پورے وجود میں درد کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ اور آنکھوں میں اچانک اتر آنے والا یلاب تو روکے نہ رکھا۔ بمشکل تمام اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور اپنے کمرے کی طرف اترے ہوئے اس نے ابو جی کو کہتے سنا۔

”ٹھیک ہے خاتون! سب کچھ آپ کی خواہش کے مطابق ہو جائے گا۔“

”ابو جی نے کیوں مان لیا۔“

انتہائی دکھ سے سوچتے ہوئے وہ لحاف میں جا چھپی۔ آنکھوں کا پانی پہلے ہی پلکوں سے ملک چکا تھا اور اب تو روانی سے بہنے لگا۔ کچھ دقت پہلے وہ اسی جگہ بیٹھی خوبصورت خواب سجا رہی اور اب ان کے ریزوں کی جھین آنکھوں میں بلکہ روح تک میں جا اتری تھی۔ دل چاہ رہا تھا چیخ کر روئے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی اس لئے بچے میں سر دے کر سکتی رہی۔

پاؤں یہاں سے گزرنا چاہتی تھی اور ابھی پہلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ آذر کی والدہ غالباً ابو جی کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھیں۔

”بھائی صاحب! آپ کے لئے کیا مشکل ہے۔ سرکاری ملازم ہیں۔ ذرا۔ اشارے پر ایک کیا دس ٹی وی آجائیں گے۔ آپ دس نہ لیں ایک ٹی وی لے لیں۔ اور پھر ہم کو سا اپنے لیے مانگ رہے ہیں۔ اپنی بیٹی کو ہی دیں گے وہی دیکھے گی۔“

”میرے خدا!“ اس نے بہت آہستگی سے اپنا پورا وجود دیوار کے ساتھ لگا لیا۔ اور آجی کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن ابو جی اور امی میں سے کسی کی آواز نہیں آئی۔ دوبارہ آذر والدہ کی آواز آئی۔

”الیکٹرانک کے سامان میں آپ کیا دے رہے ہیں؟ صرف ایک ٹیپ اور ٹیپ؟ آج کل بغیر ڈیک کے کوئی سننا پسند نہیں کرتا۔ نہ فرنج نہ واشنگ مشین نہ ٹی وی اور نہ وی سی آر جے اب تو ایک عام سا آدی بھی یہ ساری چیزیں بڑے آرام سے جینز میں دیتا ہے۔ اور آپ تو ماشاء اللہ اچھے خاصے عہدے پر ہیں۔“

”میں نے کبھی اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔“ ابو جی کی آواز کا رعب جا۔ کہاں کھو گیا تھا۔

”میری جتنی حیثیت ہے میں نے اسی کے مطابق بیٹی کو جینز دیا ہے۔ ہاں اگر اس بڑھ کر کر سکتا تو ضرور کرتا آپ کو کہنے کی ضرورت کبھی پیش نہ آتی۔“

”لیکن بھائی صاحب! اس معمولی سے سامان کے ساتھ ہم آپ کی بیٹی کیسے بیاہ لے جائیں۔ اپنی برادری میں ہم کیسے یہ معمولی سا سامان دکھائیں گے؟“

”کوئی ضروری نہیں ہے۔ آپ برادری میں نہ دکھائیں۔“ امی کی دھیمی آواز آئی۔
 ”واہ! یہ کیسے ممکن ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ ہم نے آذر کا رشتہ ایک سرکاری افسر کے گھر کیا ہے۔“

”تم کیوں گئیں کچن میں؟ مجھ سے کہا ہوتا۔“ امی نے کہا تو اس نے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبایا اور بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم دونوں اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو مجھے۔ کیا میں بدلی ہوئی نظر آ رہی ہوں؟“

”تم کیا بدلو گی۔“ نومی نے ہلکے پھلکے انداز میں اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی جبکہ وہ اسی طرح سنجیدگی سے بولی۔

”انسان کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے اور میں بھی انسان ہی ہوں۔ خیر چھوڑو کیا بات کر رہے تھے؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔ بس ایسے ہی امی کے پاس آ بیٹھے تھے۔“

”اچھا۔“ وہ افسردگی سے مسکرائی اور امی کا ہاتھ دباتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں جانتی ہوں تم دونوں یونہی ایک جگہ تک کر بیٹھنے والے نہیں ہو اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے آنے سے پہلے یہاں کون سا مسئلہ زیر بحث تھا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ نومی اور شوبی کی سوالیہ نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے امی کی طرف دیکھنے لگی۔ اور ان کے نظریں چرانے پر بولی۔

”معاف کیجئے گا امی! یہ ہے تو غیر اخلاقی حرکت، لیکن مجھ سے سرزد ہو گئی ہے۔ رات یہاں سے گزرتے ہوئے میں نے آذر کی والدہ کی ساری باتیں سن لی تھیں۔“

”بیٹا! شادی بیاہ کے معاملوں میں ایسی باتیں تو ہو ہی جاتی ہیں۔“

”نہیں امی! وہ فوراً بول پڑی۔“

”یہ باتیں پہلے طے کر لی جاتی ہیں تاکہ ایسے وقت جب دوسرا بے بس ہو اور لاالوں کی بات ماننے پر مجبور ہو جائے۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”میں تو یہی کہوں گی کہ آذر کے گھر والے شاید اسی انتظار میں تھے کہ ہمارے شادی

ذہن کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا اور نہ بہت کچھ سوچ ڈالتی۔ ڈرائنگ روم سے اسے ڈھونڈ کی آواز آ رہی تھی اور گانا کم ہنسنے کی آواز زیادہ تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ جس کے لئے یہ اہتمام کیا گیا ہے اس پر کیا بیت گئی۔ اس کے آنسو کسی طرح رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے پھر اپنی حرام نصیبی پر آنسو بہاتے بہاتے وہ سو گئی۔

صبح اس کی آنکھ قدرے دیر سے کھلی۔ کچھ دیر تک بالکل خالی الذہن سی چھت کو گھر رہی پھر اچانک گھر میں غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا تو فوراً گردن گھما کر اسماء کے بیڈ کی طرف دیکھا۔ اس کا بیڈ خالی دیکھ کر خیال آیا کہ رات وہ کزنز کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ہی سو گئی ہوا اس کے ساتھ ہی بہت ساری باتیں یاد آ گئیں تو وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ اور رات تک رونے کی وجہ سے آنکھیں بھی بوجھل سی لگیں۔ جب منہ دھو کر کھڑی ہوئی تو آئینے میں آپ کو دیکھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ اتر ا ہوا۔ تویہ سے منہ صاف کر کے کمرے آئی پھر کمرے سے شوبی کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ بھی ادھر چلی جائے، لیکن پھر یہ کر کہ شاید ابو جی بھی موجود ہوں ادھر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے کچن میں آ گئی۔

اپنے لئے چائے بنا کر وہیں کھڑے کھڑے پی اور جب واپس اپنے کمرے کی طرف جاری تھی تو پھر امی کے کمرے کے سامنے رک گئی۔ نومی اور شوبی پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے۔ وہ اسی طرف آ گئی۔ اسے دیکھ کر دونوں بھائی ایک دم خاموش ہو گئے۔

”اٹھ گئیں بیٹا۔“ امی کی آواز کا بوجھل پن اسے تڑپا گیا۔ اور وہ ضبط کرتی ہوئی ان

پاس جا بیٹھی۔

”ناشتا بناؤ تمہارے لئے؟“ امی اٹھنے لگی تو اس نے روک دیا۔

”میں چائے پی کر آ رہی ہوں اور ابھی ناشتے کی خواہش نہیں ہے۔“

”چائے کس نے بنا کی تھی؟“

”میں نے خود۔“

اللہ جب اسماء کی باری آئے گی تو ہم دونوں بھائی کسی قابل ہو چکے ہوں گے اور اس وقت ابو جی کو زیادہ تر ذہنی نہیں کرنا پڑے گا۔“

”میں نے بھی یہی کہا ہے ان سے۔ اب دیکھو وہ کیا کرتے ہیں۔ خیر اب تم لوگ اس بات کو یہیں ختم کرو۔ کسی اور تک کوئی بات نہیں پہنچنی چاہئے اور زارا تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں لڑکیوں کو اٹھاتی ہوں۔“

امی بیڈ سے اتریں تو وہ بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

اپنے کمرے میں آئی تو دل چاہا۔ ایک ایک چیز کو اٹھا اٹھا کر پٹخنا شروع کر دے۔ دل میں آگ سی لگی تھی جو کسی پل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ کاش وہ کسی طرح آذر ملک تک رسائی حاصل کر سکے اور اس سے پوچھے کہ تم کیسے مرد ہو جو اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنے کی بجائے دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ اس کے دل کا بوجھ سوا ہو گیا اور آنکھوں کی نمی پلکوں تک اتر آئی تھی اسی وقت اسماء اور بیٹا کی آواز آئی۔ وہ شاید اٹھ کر ادھر ہی آ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اپنے بیڈ پر چلی گئی اور منہ لحاف کے اندر کر لیا۔

”زارا! سو رہی ہو کیا؟“ اسماء نے اس کا لحاف ہلا کر پوچھا تو بیٹا اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

”سونے دو۔ یہی چار دن ہیں سکون سے سو لے پھر ایسی بے خبری کی نیند کہاں نصیب ہوگی بھلا۔“

”ہاں!“ اسماء اس کے ساتھ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی اور وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے سے نہ روک سکی۔

پھر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر لڑکیاں گھر کی صفائی ستھرائی میں لگ گئیں۔ اس کے بعد کچھ نے کچن سنبھالا اور کچھ اس کے جوڑے ٹانگنے بیٹھ گئیں۔ کئی بار اسماء اسے بلانے آئی کہ وہ بھی ان کے پاس آ بیٹھے۔ لیکن اس نے سہولت سے منع کر دیا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کارڈز سب کے گھروں میں پہنچ جائیں تو وہ اپنی ڈیمانڈز لے آئیں تاکہ ہم انکار کرنا بھی چاہ نہ کر سکیں۔“

”میں بھی یہی بات کہہ رہا تھا۔“ نومی نے کہا تو وہ لمحہ بھر کو اس کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

”آپ ہی بتائیے اگر وہ لوگ اپنی فرمائشیں زیادہ نہیں صرف ایک ہفتہ پہلے آتے تو کیا ابو جی مان لیتے۔ کبھی نہیں۔ بلکہ اسی وقت یہ رشتہ ختم کر دیتے۔“

”بیٹا! تم یہ سب باتیں مت سوچو۔“

”کیسے نہ سوچوں۔ میں تو کہتی ہوں ابھی بھی وقت ہے صاف منع کر دیں۔“

”نہیں زارا!“ شوبی چھوٹا ہونے کے باوجود اسے سمجھانے لگا۔

”یہ ممکن نہیں ہے۔ اپنے پرانے سب جانتے ہیں کہ چار دن بعد تمہاری بارات والی ہے۔ اب اگر بات ختم کر دی گئی تو لڑکے والوں کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ لوگ ہمیں ہی بتائیں گے۔“

”شوبی ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ امی نے تائید کی۔

”اور پھر تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے ابو جی نے ان کی بات ہے تو انشاء اللہ ان کی ڈیمانڈز بھی پوری کر دیں گے۔“

اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ امی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ”بیٹا! اولاد کی خوشیوں کی خاطر والدین کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔“

”آپ سمجھتی ہیں۔ میں خوش رہوں گی۔ نہیں امی یہ مادی چیزیں میری خوشی ضامن کبھی نہیں ہو سکتیں۔“

”زارا پلیز۔ اس طرح کی باتیں مت کرو۔“ نومی نے ٹوک دیا پھر امی سے کہنے ”آپ ابو جی سے کہیں اسماء کی فکر چھوڑیں۔ ابھی جو کچھ ہے زارا پر خرچ کریں

کی باتوں سے کچھ زیادہ ہی دل برداشتہ ہو گئی ہے اور ابو جی کے سامنے حوصلہ ہار کر یوں رونے لگی ہے۔ اسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”اس طرح کیوں رو رہی ہو؟“ وہ جواب دینے کی بجائے امی کے کندھے پر سر رکھ کر چیخنے لگی۔ نوی نے ابو جی کو یوں چپ چاپ لیٹے دیکھا تو آلے پیروں باہر بھاگا۔ کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر کے ساتھ واپس آیا۔ ڈاکٹر نے سب کو ایک طرف ہٹایا اور جھک کر ابو جی کو دیکھنے لگا۔

”ہارٹ فیل۔“ ڈاکٹر سیدھا کھڑا ہوا تو اس کے ہونٹوں سے نکلے اس لفظ نے کمرے میں چھائے سکوت کو دور ہم برہم کر دیا۔

وہ شخص جو زندگی بھر اپنے اصولوں میں بہت سخت رہا تھا۔ آج بیٹی کی خاطر شاید کچھ نرمی پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن دل نے ساتھ ہی نہیں دیا۔ پہلے یقیناً مچلا ہوگا پھر ٹھہر گیا یوں کہ اس گھر کے در و دیوار سے نکراتی چیخیں بھی اس میں حرکت پیدا نہ کر سکیں۔

عزیز رشتے دار چار دن بعد ویسے بھی اس گھر میں آنے والے تھے اس گھر کی سب سے پہلی خوشی میں شریک ہونے لیکن ابو جی نے پہلے ہی سب کو بلالیا۔ زارا کی ڈولی کو کندھا بعد میں دینا پہلے مجھے کندھا دو۔

”یہ اچانک کیا ہو گیا؟“

”کل تک تو ٹھیک ٹھاک تھے۔“

آنے والے اسی قسم کے جملے بول رہے تھے۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھتی رہی۔ اس کی چیخیں اچانک تھم گئی تھیں۔ ہونٹ ایک دوسرے میں مدغم ہلکے ہلکے لرز رہے تھے۔ اس کے پاس ساری باتوں کا جواب تھا۔ ہر اک کو بتا سکتی تھی کہ ابو جی کو اچانک کیا ہو گیا اور وہ بتانا بھی چاہتی تھی لیکن آواز اندر ہی کہیں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ بس اس وقت وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی جب آذر کی والدہ کو آتے دیکھا۔ ساری توانائیاں صرف کر کے وہ اسی قدر کہہ سکی۔

”مارڈالا۔ میرے ابو جی کو مارڈالا۔“

دل پر بوجھ تو تھا ہی اب اچانک ایک انجانا سادھڑکا بھی لگ گیا تھا۔ پتا نہیں کیا ہوا کیا ہونے والا ہے۔ اس خیال سے دل سہا جا رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا اس نے سب کے اصرار اور بے حد مجبور کرنے پر ان سب کے ساتھ بیٹھ کر کھایا بلکہ زہر مار کیا۔ اس کے بعد دوبارہ اپنے کمرے کی طرف آرہی تھی کہ ابو جی کو آتے ہوئے دیکھا وہ اس وقت تو کبھی نہیں آتے تھے۔ اسے اچنبھا ہوا اور وہیں رک کر انہیں دیکھنے لگی۔ وہ بے حد تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ چہرے پر تفکرات کی لکیروں کا جال یقیناً رات والی باتوں سے بنا تھا۔ اسے کھڑے دیکھ کر وہ رک گئے اور وہ فوراً آگے بڑھ کر پوچھنے لگی۔

”ابو جی! آپ ٹھیک تو ہیں؟“

”ہاں بیٹا! میں ٹھیک ہوں بلکہ سب ٹھیک ہے۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ لمحہ بھر کو اسے اپنے سر پر بے حد مضبوط سائبان کا احساس ہوا اور پھر نو، ہی ایسے لگا جیسے سرنگا ہو گیا ہو۔ پیرد تلو سے زمین کھسکے لگی اور سر پر سے چھت۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے گھبرا کر اس پاس دیکھا۔ دیواریں بل رہی تھیں لیکن نہیں زلزلوں کی زد میں وہ خود تھی۔ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر زور زور سے جھٹکے دیے اور پچے یوں لگا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اسے ابو جی کے کمرے میں دھکیل رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ ان کے بیڈ کے پاس کھڑی دیکھ رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے چپ چاپ لیٹے تھے۔

”ابو جی!“ بہت آہستہ آواز میں پکارا۔ جواب نہ ملا۔

”ابو جی!“ قدرے اونچی آواز پھر اور اونچی۔

اس کے بعد پکار چیخ میں بدل گئی۔ ابو جی موجود ہوتے تو سنتے۔ وہ تو شاید اس کا خوشیاں خریدنے کسی اور جہاں میں نکل گئے تھے۔

”میں ٹھیک ہوں بلکہ سب ٹھیک ہے۔“ ابھی چند لمحے پہلے تو انہوں نے کہا تھا اور انہوں نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر سب ٹھیک ہو جانے کا اشارہ دیا تھا۔

اس کی چیخوں سے پورا گھر دہل گیا تھا۔ سب بھاگے چلے آئے۔ امی سمجھیں وہ رانا

پھر اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ گرنے سے پہلے اس نے دیکھا۔ نومی اور شوبی اس کی طرف بڑھ رہے تھے پھر کچھ یا نہیں رہا۔

☆☆☆

زندگی میں اچانک اس طرح تبدیلی آجائے گی۔ کبھی کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ابو جی کے جانے سے گھر کے در و دیوار تک میں دیرانیاں سٹ آئی تھیں۔

ابو جی اس طرح کبھی نہ جاتے۔ وہ اس دن سے اب تک یہی بات سوچ رہی تھی۔

”اگر ایک عورت بیٹے کی ماں ہونے کا زعم لئے نہ آتی۔ یہ صحیح ہے کہ موت کا ایک وقت معین ہے لیکن آؤر کے گھر والے کبھی بھی بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ وہ سب کے سامنے انہیں الزا دینا چاہتی تھی لیکن امی نے اپنی قسم دے کر اس کی زبان بند کر دی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ کہہ دینے۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور جو کچھ ہوا وہ اسے خدا کی رضا جان لیتی۔ لیکن اب امی کی قسم سے مجبور ہوا ساری باتیں اندر ہی اندر ذخیرہ کرتے ہوئے وہ پاگل ہونے لگی تھی۔ ابو جی گھر کے سربراہ واد کمانے والے تھے۔ بہن بھائیوں میں وہ سب سے بڑی تھی۔ گزشتہ سال اس نے بی اے کیا اس کے بعد اسماء بی اے فائنل میں تھی۔ پھر نومی اور شوبی دونوں انجینئرنگ کے دوسرے سال میں تھے۔ اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں بہت سارے سال چاہئیں تھے۔

اولین دنوں میں جب لوگ شادی کے بارے میں کہتے تو اس کا دل چاہتا کہنے والے منہ نوچ لے۔ اس وقت وہ کوئی دوسری بات سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہیں تھی لیکن جب وقت بہت غیر محسوس طریقے سے دل پر صبر کا مرہم رکھ دیا تو بہت ساری باتیں اور مسائل اس کے سامنے آ گئے۔

گھر میں سب سے بڑی ہونے کے ناتے اس نے سب سے پہلے اور زیادہ محسوس اور یہ بھی جان گئی کہ گھر کی ناؤ جس بھنور میں پھنسی ہے وہاں سے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے نہیں نکلا سکتا۔ وہ با حوصلہ نہیں تھی بلکہ گھر کے روایتی ماحول نے اسے خود اعتمادی تک نہیں بخشی تھی۔ اب تک

کی زندگی پہلے گھر سے اسکول اور پھر کالج تک محدود رہی تھی اس کے علاوہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے وہ نہیں جانتی تھی۔

سیدھی سادی زندگی میں یہ جو اچانک سانحہ رونما ہو گیا تھا اس سے وہ خاصی بوکھلا گئی تھی۔ پھر بھی اس نے سوچا میرے ساتھ جو ہونا ہے وہ ہو گیا اب اس پر کڑھنے کی بجائے اسے گھر کی فکر کرنی چاہئے اور ابھی وہ امی کو حوصلہ دے ہی رہی تھی کہ تایاجی اور چچاجی آ گئے۔ امی سے کہنے لگے۔

”بھائی کی بے وقت موت نے جو خلا پیدا کر دیا ہے وہ یقیناً زندگی بھر پر نہیں ہو سکے گا۔ شاید خدا کی یہی مرضی تھی۔ ہم بے اختیار بندے بھلا کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن مرنے والے کے ساتھ دنیا کے کام ختم نہیں ہو جاتے۔ نہ ہی رکتے ہیں۔ فوری طور پر نہ سہی لیکن بہر حال زندگی معمول پر آ ہی جاتی ہے۔

یہ سانحہ زارا کی شادی کے دنوں میں ہی رونما ہوا تو ظاہر ہے مقررہ تاریخ پر اس کی شادی نہ ہو سکی۔ بہر حال آج نہیں تو کل اس فرض سے سبکدوش تو ہونا ہی ہے تو پھر کیوں نہ کوئی نزدیکی تاریخ لے کر اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔“

اس تمام عرصے میں امی نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا۔ اب جو جینٹھ اور دیوریم بھتیجی کے سر پر ہاتھ رکھ رہے تھے تو امی کہنے لگیں۔

”آپ سب کے ہوتے ہوئے مجھے واقعی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ ابھی آپ کے بھائی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہوگا۔“ امی کی آواز بھرا گئی تھی۔

”آپ غلط نہیں کہہ رہیں۔“ تایاجی کہنے لگے۔

”لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ زارا کی شادی آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ اور فرائض کی ادائیگی جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔“

”ہاں بھابی!“ چچاجی نے تائید کی۔

”رشتے کا مسئلہ تو ہے نہیں، جو ہم سوچیں کہ جب اچھا رشتہ ملے گا۔ تب کریں گے۔
بات طے ہے بس تاریخ لے لیں۔“

”امی کی سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دیں۔ اصل میں ان کا دل آمادہ نہیں تھا۔ کاش اللہ میاں زارا کے ابو جی کو کچھ مہلت عطا کرتے تو آخری وقت وہ اپنے دل کی بات کہہ سکتے۔ پتا نہیں انہوں نے کیا سوچا تھا۔ ساری باتیں دل میں ہی لئے چلے گئے۔ اور اب وہ شش و پنج میں تھیں کہ کیا کریں۔ بے بسی سے تایا جی اور چچا جی کی طرف دیکھا۔ وہ ان کے جواب کے منتظر تھے۔

”آپ کو کیا بات پریشان کر رہی ہے؟“ تایا جی بڑے تھے۔ امی کو ابھن میں محسوس کر کے پوچھنے لگے اور ابھی امی کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ زارا اندر آگئی۔ وہ یونہی نہیں آئی تھی۔ ابھی اسماء نے اسے بتایا تھا کہ یہاں اس کی شادی کا پروگرام بن رہا ہے۔ وہ فوراً اپنی منگنی کی انگلی لے کر آگئی اور میز پر رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”تایا جی! میں شادی نہیں کروں گی۔ میرا مطلب ہے آذر کے ساتھ۔“

”کیوں بیٹا؟“ تایا جی کا انداز اور لہجہ ابو جی جیسا ہی تھا۔
”زارا!“ امی نے ٹوکا اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

”ارے ارے۔“ چچا جی نے اٹھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر اسی طرح اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولے۔

”بیٹا! روؤ مت۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟“

”کوئی بات نہیں ہے۔“ امی نے ٹالنا چاہا۔ لیکن اس نے روتے ہوئے ساری صورت حال کہہ سنائی آخر میں کہنے لگی۔

”چچا جی! میں اپنے دل سے یہ بات کبھی نہیں نکال سکوں گی کہ ان لوگوں کی باتوں کی وجہ سے ابو جی کی جان گئی۔ اور آپ ہی بتائیں ایسی صورت میں میں وہاں خوش رہ سکوں گی؟ خوش

رہنا تو دور کی بات میں اس گھر میں جانا بھی نہیں چاہتی۔ اور مجھے یقین ہے امی بھی ایسا نہیں چاہتی ہوں گی۔“

وہ پھر رونے لگی۔ تو تایا جی اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”بیٹا! تم نے صحیح فیصلہ کیا ہے!“ پھر امی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”آپ نے یہ ساری باتیں ہمیں کیوں نہیں بتائیں؟“

”کیا بتاتی۔ میری تو اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔“

”بس اس رشتے کو ختم کر دیں۔ زارا واقعی وہاں کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔“ تایا جی نے

فیصلہ سنا دیا۔ پھر اس سے کہنے لگے۔

”بیٹا! جاؤ منہ دھولو۔ اور سنو۔ اب تم نے رونا نہیں ہے۔ اپنی امی کی حالت دیکھ رہی

ہو۔ انہیں تم نے سنبھالنا ہے۔ اور چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی۔“

”جی!“ وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے کو تھی کہ تایا

جی اسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔

”ایک بات سننی جاؤ۔ جیسا کہ تم جانتی ہو کہ یہ گھر سرکاری ہے اور کچھ دنوں میں اسے

خالی کرنے کا نوٹس آجائے گا۔ تو ایسی صورت حال میں تم سب میرے گھر شفٹ ہو جانا۔ بلکہ میں تو

چاہتا ہوں نوٹس آنے سے پہلے ہی.....“

”تایا جی! مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”میں سمجھتی ہوں اگر ہم ابھی آپ کے گھر آئے تو آئندہ زندگی میں آزمائشوں کا سامنا

کبھی نہیں کر سکیں گے اس لیے آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم خود اس آزمائش سے نکلنے کی کوشش

کریں۔“

”جیتتی رہو بیٹا! خوش رہو۔ بیٹیوں کو ایسے ہی بہادر ہونا چاہئے۔ لیکن اپنے آپ کو تنہا

”یہی کہ ہم اس رشتے کو ختم کر رہے ہیں۔“ اسماء کچھ دیر تک غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر الجھ کر پوچھنے لگی۔

”لیکن کیوں؟ کس نے کیا ہے یہ فیصلہ؟“

”یہ ہم سب کا فیصلہ ہے۔“ پھر اسماء کو ساری تفصیل بتاتے ہوئے وہ رو پڑی۔ اسماء بے حد حیران تھی اور شاید اسے یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔ جیسی پوچھنے لگی۔

”کیا واقعی اس دن آذر بھائی کی والدہ اور بہنیں ڈیمانڈز لے کر آئی تھیں؟“

”تو کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”نہیں! تم غلط کیوں کہو گی لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ وہ آنکھیں صاف کر کے سوالیہ نظروں سے اسماء کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں حیران ہو رہی ہوں کہ کیا آذر بھائی بھی ایسے ہو سکتے ہیں؟“ پھر کچھ سوچتے ہوئے سرکوفی میں ہلانے لگی۔

”نہیں زارا! میرا دل نہیں مانتا۔ آذر بھائی یقیناً اس ساری بات سے بے خبر ہوں گے۔“

”ناممکن!“ وہ فوراً بول پڑی۔

”آذر اپنے گھر میں سب سے بڑے ہیں۔ سر پر باپ بھی نہیں ہے۔ اس لئے یقیناً ان کے گھر کا ہر کام اور ہر بات ان کے مشورے ہی سے ہوتی ہوگی۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ اس کے باوجود میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس معاملے میں انہیں بے خبر رکھا گیا ہوگا۔“

”تم آذر کے بارے میں اتنے یقین سے کیسے بات کر رہی ہو؟“ وہ ناگواری سے بولی۔

”اس لئے کہ میں گزشتہ چھ ماہ میں بارہا ان سے ملی ہوں۔ اور وہ مجھے کسی پہلو سے بھی

مت سمجھنا۔ کبھی کوئی مشکل گھڑی یا کوئی ضرورت ہو تو بلا جھجک میرے پاس آنا۔“

”آپ ہی کے پاس آؤں گی۔“ وہ جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ ہلکا سا مسکرائی اور پھر ان سے اجازت لے کر کمرے سے نکل آئی۔

رات میں وہ یونہی اپنا ذہن ہٹانے کی غرض سے ایک میگزین لے کر بیٹھی ہی تھی کہ اسماء کے پاس آکر بہت رازداری سے کہنے لگی۔

”سنو! آذر بھائی کا فون آیا ہے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ بے حد خاموش نظروں سے اسماء کی طرف دیکھنے لگی۔

”مجھے کسی سے بات نہیں کرنی۔“

”آذر بھائی کسی نہیں ہیں۔“

”وہ کسی ہی ہے۔ اور کہہ دو اس سے کہ آئندہ ہمارے گھر کا نمبر ڈائل کرنے کی کوشش نہ کرے۔“

”زارا؟“ ہر بات سے لاعلمی کی بنا پر اسماء کی حیرت بجا تھی۔

”میں نے جو کہا ہے وہی کرو۔“ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے بڑے ہونے کا رعب جمایا اور اسماء سے اس قدر سنجیدہ دیکھ کر اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آ کر کہنے لگی۔

”مجھے آذر بھائی سے جھوٹ بولنا پڑا ہے کہ تم امی کے پاس بیٹھی ہو۔“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے منع کر دو کہ آئندہ یہاں رنگ نہ کرے۔“

”زارا!“ اسماء اس کے پاس آ بیٹھی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو۔ آذر بھائی اس گھر کے.....“

”اسماء۔“ اس نے ٹوک دیا۔

”جب تم کوئی بات نہیں جانتیں تو خواہ مخواہ بحث کیوں کرتی ہو؟“

”کیا نہیں جانتی میں؟“

”تم نے اچانک جو آذر سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ سنا دیا ہے۔ تو میں اس وجہ سے پریشان ہو رہی ہوں۔ مجھے تمہارے فیصلے سے اختلاف نہیں ہے۔ اور شاید اتفاق بھی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ امی کو ابھن میں محسوس کر کے وہ بھی الجھتے ہوئے بولی۔

”بیٹا! تم نے تو بہت سہولت سے کہہ دیا کہ آذر سے شادی نہیں کرو گی۔ اور تمہارے تایا جی اور چچا جی نے بھی تمہاری بات سے اتفاق کر لیا لیکن بیٹا ذرا آگے کی بھی تو سوچو۔“

”کیا سوچوں؟“

”یہی کہ تمام عزیزوں اور رشتہ داروں میں کارڈز تقسیم ہو چکے ہیں۔ لوگ تو جانتے ہیں کہ شادی ملتوی ہوئی۔ لیکن نسبت ٹوٹ جانے کی ہم کیا وجہ بتائیں گے۔ کیا ہر ایک کے سامنے ان کی اصلیت بے نقاب کرنا کچھ عجیب سا نہیں ہے۔ اور پھر کتنے لوگ ہماری بات کا یقین کریں گے۔“

”ہمیں کسی کا یقین حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”بیٹا! تم ابھی نادان ہو جبکہ میں بیٹی کی ماں بن کر سوچ رہی ہوں۔“

”بیٹی کی ماں ہونا کوئی جرم ہے کیا؟“

”شاید۔ آج کے اس دور میں سب سے بڑا جرم یہی ہے۔ تم نہیں جانتیں بیٹا کہ بیٹیوں والے قصور دار کبھی بھی نہیں ہوتے۔ لیکن ہمیشہ قصور دار ٹھہرائے جاتے ہیں۔“

”امی غلط نہیں کہہ رہیں۔“ اسماء گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہنے لگی۔

”اور پھر ہو سکتا ہے آذر بھائی کی والدہ اور بہنیں اپنی اس حرکت پر نادم ہوں۔“

”ان کے نادم ہونے سے ابو جی واپس آ جائیں گے کیا؟“ وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی لگاتے ہوئے بہت دکھ سے بولی۔

”بیٹا! اس طرح مت سوچو۔ خدائی کاموں میں کسی کا دخل نہیں ہوتا۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ میرا دل کسی طرح سے بھی انہیں بری

ایسے نہیں لگے۔ اور اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے تو ابھی فون کر کے خود آذر بھائی سے بات کر لو۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے ان سے بات کرنے کی۔ اور انہوں نے کون سا اعتراض کر لینا ہے۔ ظاہر ہے صاف مکر جائیں گے۔“ اسماء نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ انہوں نے ٹوک دیا۔

”بس اب تم اس معاملے میں کچھ نہیں بولو گی اور ان کی طرف داری کرنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ وہ میرے ابو جی کے قاتل ہیں اور میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”اور کان کھول کر سن لو اسماء! اگر تم نے اپنے طور پر آذر سے اس بات کی تصدیق تردید کرانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

اسماء نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتی رہا پھر اٹھنے کو تھی کہ امی آگئیں۔ ان کی آنکھوں میں سوچ اور چہرے پر تفکرات کی لکیروں کا جال بکھرا زیادہ نمایاں ہو رہا تھا۔ اس نے بہت خاموشی سے ان کا جائزہ لیا۔ پھر اپنے پاس جگہ بناتے ہوئے بولی۔

”آئیے امی! بیٹھیں۔“ امی بیٹھ گئیں اور باری باری دونوں کو دیکھنے لگیں۔

”کیا بات ہے۔ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟“ وہ ان کا ہاتھ تھام کر پوچھنے لگی۔ پڑ خود ہی قیاس کرتے ہوئے بولی۔

”مجھے لگتا ہے۔ آپ کو کوئی بات پریشان کر رہی ہے۔ ہے ناں؟“ امی پر سوچ اندام میں اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

”کیا بات ہے؟ ہمیں بتائیں۔“

”بیٹا! امی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگیں۔

ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور جہاں تک آذر سے شادی کا سوال ہے تو اگر آپ کہیں گی تو میں اس سے شادی بھی کر لوں گی۔ لیکن ابھی نہیں۔ ابھی ہمیں اور بہت کچھ کرنا ہے۔“

”بیٹا!“ امی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”میں تمہیں اس شادی پر مجبور نہیں کر رہی اور نہ کروں گی۔ بس میں چاہتی ہوں ہم جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ ہر کام ہر بات وقت پر اور سہولت سے ہوتا کہ تم لوگوں پر کوئی آنچ نہ آئے۔“

”جیسے آپ کہیں گی ویسے ہی ہوگا۔“

اس نے اپنی ہتھیلیوں سے امی کے آنسو صاف کیے۔ پھر اسماء کو آنسو صاف کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے فوراً موضوع بدل کر نومی اور شوبی کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔

پھر اگلے دو تین مہینے دوسرے مسائل کو حل کرنے میں گزر گئے۔ یعنی ابو جی کے پرائیویٹ فنڈ اور انشورنس سے جو پیسہ ملا اس سے ایک فلیٹ لے کر وہاں شفٹ ہو گئے۔ اس دوران وہ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کی کلاسیں بھی لیتی رہی تھی۔ نومی اور شوبی کا خیال تھا کہ وہ پڑھائی چھوڑ کر کوئی کام وغیرہ تلاش کریں گے۔ لیکن اس نے سختی سے منع کر دیا۔ وہ خود جاب تلاش کر رہی تھی۔ یوں گھر کی ناک کسی کنارے لگانے کے چکر یا جدوجہد میں وقتی طور پر اس کا مسئلہ آپ ہی آپ پس منظر میں چلا گیا تھا۔

دوسرے اس دوران آذر کے گھر سے کوئی آیا بھی نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ لوگ شرمسار تھے یا اب انہیں اس گھر سے اپنی مطلوبہ چیزیں جہیز میں ملنے کی امید نہیں رہی تھی جو انہوں نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ بہر حال فلیٹ میں شفٹ ہونے کے بعد امی نے چاہا کہ گھربہ لے کر اطلاع ان لوگوں تک پہنچا دی جائے۔ لیکن اس نے منع کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ان لوگوں کو غرض ہوگی کسی سے پوچھ کر بھی آسکتے ہیں۔ دوسری صورت میں وہ یہ سمجھیں گے کہ ہم ان کے منتظر بیٹھے ہیں۔

الذمہ قرار دینے پر آمادہ نہیں۔ آپ یقین کریں امی! جب آذر کی والدہ پر نظر پڑتی ہے تو پہلا خیال یہی آتا ہے کہ یہ میرے ابو جی کی قاتل ہیں۔ آپ ہی بتائیں اس خیال کے ساتھ کیا میں ایک عمر ان کے ساتھ رہ سکوں گی۔“

امی خاموشی سے اس کی طرف دیکھے گئیں۔ پھر کہنے لگیں۔

”یہ خیال تو مجھے بھی آتا ہے۔ لیکن کیا کروں کہ اب جب کہ سر پر سائبان نہیں رہا تو میرے اپنے اندر لوگوں کی باتیں سننے کا حوصلہ نہیں پاتی۔“

”پھر آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“

”میں چاہتی ہوں۔ ابھی تم کوئی فیصلہ مت کرو یا اگر فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہر ایک کو اس سے آگاہ مت کرو۔“

”کیا مطلب؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سرائٹھاکرامی کی طرف دیکھنے لگی۔

”میرا مطلب ہے اگر فوراً سب کو معلوم ہو گیا کہ تم وہاں شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ نہ سب یہی کہیں گے کہ بات کے مرتے ہی بیٹی نے من مانی شروع کر دی۔ اور جیٹا! تم لوگوں پر کوئی بات آئے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ میں بہت کمزور عورت ہوں۔ پھر سائبان چھن جائے تو میں بالکل ٹوٹ چکی ہوں۔“

امی کی آواز بھرائی تھی اور ساتھ ہی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔ وہ اور اسماء جو محض امی کو وجہ سے بڑے ضبط سے بیٹھی تھیں ان کے آنسو چھلکتے دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکیں۔ دونوں نے ایک ساتھ ان کی گود میں سر رکھتے ہی پلکوں پر بندھے حفاظتی بند ہٹا دیے۔

کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ اس طرح امی کے سامنے حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔ فوراً سرائٹھا کر سیدھی ہو بیٹھی۔ چادر سے آنکھیں اور چہرہ صاف کیا پھر امی کے گرد بازوؤں کا گھیر ڈالتے ہوئے بولی۔

”پلیز امی! آپ نہ روئیں۔ اور جس بات کو آپ نے اتنا بڑا مسئلہ سمجھ لیا ہے۔ وہ کوئی

”نوسر یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔“

”جیسی آپ کچھ خوفزدہ ہی نظر آ رہی ہیں۔“ اس کے سر اٹھا کر دیکھنے پر کہنے لگا۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی کوئی پرابلم ہو تو بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔ ویسے یہاں کام کرنے والے سب لوگ بہت اچھے اور تعاون کرنے والے ہیں۔ امید ہے آپ کچھ دنوں میں سیٹ ہو جائیں گی۔“

”جی۔“ وہ اس کے نرم اور شائستہ لہجے پر اندر ہی اندر خاصی الجھن محسوس کر رہی تھی۔

”ایک بات آپ کو بتا دوں۔“

وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔

”ہمارے ایم ڈی ذرا سخت مزاج کے آدمی ہیں۔ کام سے لاپرواہی اور ڈسپلن کی خلاف ورزی کسی طرح برداشت نہیں کرتے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار چائیک اس آفس کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔ اس لئے آپ ذرا خیال رکھیے گا کہ انہیں شکایت کا موقع نہ ملے۔“

”جی!“

”اوکے۔“ وہ اسے جانے کا اشارہ کرتے کرتے رک گیا۔

”معاف کیجئے گا مس عمر میں آپ سے چائے کا پوچھنا تو بھول ہی گیا۔“

”نوسر تھینک یو۔“ وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ چائے پیتی نہیں ہیں یا.....!“

”اس وقت نہیں۔“ وہ اس کی بات پوری کر کے کمرے سے نکل آئی۔

”کس قدر دوغلا شخص ہے۔“ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے سوچا۔

”اپنی شخصیت پر مصنوعی خول چڑھا کر سمجھتا ہے اندر کے عیب چھپالے گا۔ ویسے بڑا

دبصورت خول چڑھایا ہے۔ میں اگر اس کی حقیقت نہ جانتی تو یقیناً دھوکہ کھا جاتی۔“ اس کے اندر

حیر ساری تلخی اتر رہی تھی۔ اور نفرت کا احساس دھیرے دھیرے غالب آ رہا تھا۔

یہاں نوی اور شوبی اور اسماء نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ جیسی امی کو خاموش ہونا پڑا۔

☆☆☆

آذر سے اس کی ملاقات اچانک یا اتفاقاً نہیں تھی۔ وہ باقاعدہ پلاننگ کے بعد کچھ مراحل سے گزرتے ہوئے اس تک پہنچی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس نے کسی کو آگاہ نہیں کیا تھا بڑی تک و دو کے بعد اس فرم میں جاب حاصل کر پائی تھی جہاں آذر جنرل منیجر کی کرسی پر براہ تھا۔ اس کا آفس میں تیسرا دن تھا۔ جب آذر نے آتے ہی اسے اپنے کمرے میں بلوا بھیجا۔ گنا دوروز سے اس نے بس دور ہی سے اسے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور خیال تھا کہ بہت اعتماد اس کا سامنا کر سکے گی۔ لیکن اب اس کی کمرے کی طرف جاتے ہوئے لگا۔ جیسے وہ کچھ خوں ہے۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو حوصلہ دیتے ہوئے اس کے سامنے کھڑی ہوئی، تب بھی نزو رہی تھی۔

”زارا عمر۔“ کسی فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے بس لمحہ بھر کو سر اٹھا کر اس کی طرف

دیکھا۔ پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

”جی۔“ وہ بس اسی قدر کہہ سکی۔

”پلیز۔“ بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر فائل بند کر کے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو

جب وہ بیٹھ گئی تو پوچھنے لگا۔

”کیسا لگا آپ کو آفس اور ساتھ کام کرنے والے لوگ؟“

”سب اچھے ہیں۔“ وہ سر جھکا کر آہستہ آواز میں بولی۔

”کوئی شکایت یا پرابلم؟“

”نوسر۔“

”گڈ۔“ ریو الونگ چیئر کی بیک سے سر نکا کر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھنے

”اس سے پہلے بھی کہیں جاب کی ہے آپ نے؟“

اشتیاق سے پوچھنے لگی

”ہاں۔“ وہ اسی طرح سنجیدہ تھی۔

”اور اب یہ ملاقات روز ہوا کرے گی۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہم دونوں ایک ہی جگہ جا کر رہے ہیں۔“

پھر اس نے اسماء کو تفصیل سے بتایا کہ اسے یہاں جا کر رہنے میں کتنی دشواریوں کا

سامنا کرنا پڑا اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔

”کیا مقصد ہے تمہارا اور تم کیا چاہتی ہو؟“ اس کی ساری بات سن کر اسماء پوچھنے لگی۔

”میں ابو جی کے قاتل کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اور آج جب اسے قریب

سے دیکھا تو وہ اپنی مکروہ شخصیت پر شائستگی کا خول چڑھائے نظر آیا۔“ قدرے توقف کے بعد وہ کہنے لگی۔

”وہ زیادہ دن تک اس خول کے سہارے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتا میں بہت جلد

اسے بے نقاب کر دوں گی۔“

”زارا! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اور یہ اچانک تمہیں کیا سوچھی؟“

”اچانک نہیں اسماء! میرے اندر تو اسی روز انتقام کی آگ جل اٹھی تھی۔ جس روز ابو جی

ان کی بے جا خواہشات کے آگے زندگی ہار گئے تھے۔ اور یقین کرو، اس تمام عرصے میں، میں ایک

پل کے لئے بھی اس احساس سے نہیں نکلی۔ وہ میرے باپ کا قاتل ہے۔ میں اسے کبھی معاف

نہیں کروں گی۔“

”زارا! اسماء اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر کہنے لگی۔

”تم یہ مت سمجھنا کہ میں آذر بھائی کی دکالت کر رہی ہوں۔ انہوں نے اپنی شخصیت پر

کوئی خول نہیں چڑھا رکھا۔ وہ شروع سے ہی ایسے ہیں۔ گفتار میں نرمی اور لہجے میں شائستگی، یہ ان

رات میں جب اسماء بچن کے آخری کام نمٹا کر سونے کی غرض سے کمرے میں آئی تو چھت پر نظریں مرکوز کئے جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ اسماء کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھ رہی پھر بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے بیڈ کے پاس آکھڑی ہوئی۔ وہ پھر بھی متوجہ نہ ہوئی۔

”زارا! اسماء نے پکارا تو وہ یونہی نظروں کا زاویہ بدل کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟ اس طرح کیوں لیٹی ہو؟“

”کس طرح؟“

”یوں چپ چاپ!“

”کوئی بات نہیں آؤ میرے پاس بیٹھو۔“ اس نے کنارے سے کھسک کر اسماء کے

جگہ بنائی۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

”امی سو گئیں کیا؟“ وہ تکیہ سیدھا کر کے ذرا سی اونچی ہو گئی۔

”ہاں! اور اب تم جلدی سے بتاؤ۔ کیا خاص بات بتانے والی ہو؟“ اسماء نے کہا

چونکہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہیں کیسے پتا کہ کوئی بات ہے۔“

”تمہارا انداز بتا رہا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسی پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

”پتا ہے اسماء میں نے اس شخص تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ جس کی تعریف!

زمین آسمان کے قلابے ملایا کرتی تھی۔

”کیا مطلب میں کس کی تعریف کیا کرتی تھی؟“ اسماء بالکل نہیں سمجھی۔

”بھول گئیں آذر کو۔“

”ارے! تمہاری آذر بھائی سے ملاقات ہوئی ہے؟“ اسماء اس کے لہجے پر غور کیا

کی شخصیت کا خاصا ہیں۔ میرا یقین نہیں تو امی سے پوچھو۔ نومی اور شوبی سے پوچھو۔ ہم یونہی تو نہیں ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔“

”ظاہر ہے۔ اس گھر سے اسے بہت کچھ لینا تھا تو وہ ایک عام سامرد بن کر تو نہیں آ سکتا تھا۔ آخر اسے سب کو مرعوب تو کرنا ہی تھا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“

اسماء جان گئی تھی کہ اگر اس نے آذر کے حق میں مزید کوئی بات کی تو وہ فوراً کہہ دے گی کہ کیا وہ تمہیں ابو جی سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لئے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن اس کا دل کسی طرح بھی آذر بھائی کے بارے میں اس انداز سے سوچنے پر آمادہ نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ شادی سے صرف چار دن پہلے ان کی والدہ اور بہنیں جو بھاری جہیز کی ڈیمانڈ کرنے آگئی تھیں۔ اس سے آذر بھائی بے خبر ہوں گے۔ اگر انہیں ذرا سا بھی اپنی والدہ کے ارادے کی خبر ہو جاتی تو وہ کبھی بھی انہیں ایسا نہ کرنے دیتے۔ زارا کا یقین اس کے برعکس تھا۔ اور وہ کسی طرح بھی اپنے یقین کو جھٹلانے پر تیار نہیں تھی۔

”سنو زارا! آذر بھائی نے تمہیں پہچانا کہ نہیں؟“ اسماء کو خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

”نہیں، اور میرا خیال ہے جب تک میں اپنا تفصیلی تعارف نہ کروالوں وہ نہیں پہچان

سکتا۔ ویسے میرے نام پر چونکا ضرور تھا۔“

”پھر خیال آیا ہوگا۔ ایک ہی نام کے کتنے چہرے۔“ اسماء ہلکے سے گنگنائی تو وہ ہنس

دی۔

”ہاں یقیناً۔“

”اور تم نے کیسے پہچانا نہیں؟“

”بھئی، تم اتنا مکمل خاکہ کھینچا کرتی تھیں اس کا اور پھر ابو جی کے سوئم پر بھی میں نے

اسے دیکھا تھا۔“

”بڑی بے ایمان ہو کبھی بتایا نہیں؟“ اسماء نے چھیڑنے کی غرض سے کہا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”کوئی خوشگوار احساس جاگتا تو ضرور بتاتی۔ اس نے تو محبتوں کی نئی کوئٹلیں جو دل کی سر زمین پر پھوٹنے لگی تھیں، بے دردی سے روند کر نذر توں کے بیج بوئے۔ اور یہ کوئی اچھی بات تو نہیں تھی۔ جو میں تمہیں بتاتی۔“

”ہاں زارا! کبھی کبھی زندگی میں وہ کچھ ہو جاتا ہے جو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔ تمہارے لئے ڈھولک پر گیت گاتے ہوئے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ یقین کرو مجھے تو یہ سب کچھ ایک خواب سا لگتا ہے۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور سب کچھ دیباہی ہوگا۔“

”تمہیں یاد ہے اسماء!“ وہ بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے افسردگی سے کہنے لگی۔

”اس سانچے سے کچھ دن قبل ہم وی سی آر پر ایک فلم دیکھ رہے تھے۔ جس میں ایسا ہی کوئی جہیز کا مسئلہ تھا۔ میں نے کتنا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سب کچھ حقیقی زندگی میں نہیں ہوتا۔“

”ہاں۔“ ہاں کی صورت میں اسماء نے سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کی۔ پھر کہنے لگی۔

”اس وقت میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن اب میں سمجھتی ہوں زارا! حقیقی زندگی کے واقعات سے ہی کہانیاں بنتی ہیں۔ یونہی کوئی اپنی طرف سے نہیں اتنا کچھ لکھ سکتا۔“

”ٹھیک کہتی ہو۔“ اس نے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر زور سے جھٹکا دیا پھر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے اب سونا چاہئے۔ کافی وقت ہو گیا ہے۔“

”واقعی، ورنہ صبح آفس میں اونگھتی رہو گی۔“ اسماء اٹھ کر اپنے بیڈ پر چلی گئی۔

”کیا مطلب؟“

”بھئی میں گوشت لے آتا ہوں۔ اسٹو بنا دو۔ بہت دن ہو گئے ہیں تمہارے ہاتھ کا

اسٹو کھائے ہوئے۔“

”تو ماموں جی! آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ نوی یا شوبی میں سے کوئی لے آئے

گا۔“

”نہیں بیٹا! بچوں کو گوشت لینے کا طریقہ نہیں آتا۔ قصاب جہاں سے کاٹ کر دے دیتا

ہے۔ اٹھا کر لے آتے ہیں۔ میں ذرا اچھا سا گوشت لے آؤں گا۔“

وہ تو نہیں سمجھی لیکن امی ضرور سمجھ گئیں کہ حالات کے پیش نظر ماموں جی ایک وقت کے

کھانے کا بار بھی نہیں ڈالنا چاہتے۔ جیسی خود سودا وغیرہ لینے چلے گئے ہیں۔ مامی جی، امی کی کیفیت

محسوس کر کے فوراً دھرا دھر کی باتیں کرنے لگی تھیں۔

”میرا خیال ہے، میں پیاز وغیرہ کاٹ لوں۔“

وہ اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگی تو اسماء اور سیمابھی اس کے ساتھ آگئیں۔

پھر دن کا بیشتر حصہ خاصا خوشگوار گزر گیا۔ کھانے کے بعد ماموں جی آرام کی غرض سے

لیٹ گئے۔ سیمابھی اسماء کے ساتھ خاصی بے تکلف دوستی تھی۔ وہ ان دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر

امی اور مامی جی کے پاس آ بیٹھی۔ مامی جی شاید اسی کے بارے میں کوئی بات کر رہی تھیں۔ اسے

دیکھ کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئیں۔ لیکن جب اسے بیٹھے دیکھا تو اپنی بات روک نہ سکیں۔

امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

”زارا کے سسرال والے کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا بھائی صاحب کی بری تک وہ لوگ

انتظار کر لیں گے؟“

فوری طور پر امی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں۔ دزدیدہ نظروں سے اس کی

طرف دیکھا تو وہ بات سنبھالنے کی غرض سے کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

”سنو! ابھی امی کو مت بتانا کہ میں آذر کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔“ اس نے سو

سے پہلے اسماء کو خاص طور سے تنبیہ کی تھی۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا۔ وہ اسماء کے ساتھ صفائی وغیرہ سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ بڑے مام

اور مامی جی آ گئے اور ان کے ساتھ اسد اور سیمابھی تھے۔ جب سے ابو جی کا انتقال ہوا تھا۔ گھر

غیر معمولی سی اداسی ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ اور اگر کوئی آ جاتا تو وقتی طور پر سب بہل جاتے تھے

اس وقت بھی ماموں جی کی بچوں کے ساتھ آمد خوشگوار لگی۔ پھر بے ہوئے ماحول میں قدرے

سج گئی تھی۔ وہ کچھ دیر سب کے ساتھ بیٹھ کر اسماء کو اشارہ کرتی ہوئی اٹھنے لگی تو مامی جی نے ا

ہاتھ پکڑ لیا۔

”بیٹا! کھانے وغیرہ کا تکلف مت کرنا۔ ہم رکیں گے نہیں۔“

”ارے واہ مامی جی۔ اتنے دنوں کے بعد تو آئی ہیں۔ ہم شام سے پہلے تو آ

جانے نہیں دیں گے۔“

”بھئی ہم تو ملنے اور تم لوگوں کی خیریت لینے آئے تھے۔ بس ایک کپ چائے پلا

وہی کافی ہے۔“

”چائے تو میں آپ کو ابھی پلا رہی ہوں۔ پھر بھی شام سے پہلے آپ نہیں جاسکتے۔“

”بیٹا! ماموں جی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول پڑی۔

”بس ماموں جی! کوئی عذر نہیں چلے گا، آپ دیکھ نہیں رہے۔ آپ کے آنے سے

کتنی خوش نظر آ رہی ہیں۔“

”اچھا یہ بتاؤ۔ کھانے میں کیا کھلاؤ گی؟“ ماموں جی ہتھیار ڈالتے ہوئے بولے۔

”جو آپ کہیں گے۔“

”جو میں کہوں گا نہیں بلکہ جو میں لاؤں گا۔“

جائے گا۔ ہمدردی صرف آڑ بن کر رہ جائے گی۔

اگلے دن آفس میں بھی وہ خاصی اپ سیٹ رہی۔ ذہن الجھا ہوا تھا۔ مای جی کی باتیں اور رات دیر تک امی کا فکر مندی سے کروٹیں بدلنا اسے بے حد پریشان کر رہا تھا۔

”مجھے مای جی کے سامنے بات نہیں بنانی چاہئے تھی۔“ اس نے سوچا۔

”اس طرح تو ہر بار مجھے ایک نیا عذر تراشنا پڑے گا۔ اور میں کب تک لوگوں کو جھوٹی داستانیں سناتی رہوں گی۔ میں ایک ہی بار کیوں نہیں سب لوگوں کے سامنے سچ بول کر بری الذمہ ہو جاتی۔“

دل چاہا اسی وقت کسی اونچی سی جگہ پر کھڑی ہو کر چیخ چیخ کر اعلان کرے۔

”میں آذر سے شادی نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔ اس لئے کہ وہ میرے باپ کا قاتل ہے۔“

”بیٹیوں والے کبھی قصور وار نہیں ہوتے لیکن ہمیشہ قصور وار ٹھہرائے جاتے ہیں۔“ امی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ اور پھر یہ کہہ کر انہوں نے شاید اسے اس کے ارادے سے باز رکھا تھا۔

”لوگ کہیں گے باپ کے مرتے ہی بیٹی نے من مانی شروع کر دی۔“

”میرے خدا، یہاں تو سچ بولنے کی سزا بھی کڑی ہے۔“

اس نے دکھ سے سوچا اور ٹائپ رائٹر پر انگلیوں کی حرکت تیز کر دی۔ آذر نے اسے کوئی بہت ضروری لیٹر ٹائپ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ جو اس کی چنی الجھن کا شکار یوں ہوا کہ خط کی بجائے درخواست بن گیا۔ درخواست بھی وہ جو میسجنگ کیٹی کو لکھی گئی ہو۔ ٹائپ رائٹر سے کاغذ نکال کر اگر وہ اس پر ایک نظر ڈال لیتی تو شاید اپنی غلطیوں کا احساس ہو جاتا۔ لیکن اس نے تو یونہی کاغذ کھینچ کر اندر بھجوا دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں فوراً اس کا بلاوا آ گیا۔

”بینیص پلیر۔“ وہ اس کا ٹائپ کیا ہوا لیٹر دیکھ رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر بیٹھنے

”مای جی! نہ صرف ابو جی کی بری تک بلکہ اس کے بعد بھی تین چار سال تک انہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ کہنا۔ ایک تو میں خود ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔ دوسرے گھر کی بڑی اولاد ہونے کے ناتے جو ذمہ داری میری ہے، میں اسے ہر حال میں نبھانا چاہتی ہوں۔ جب تک نومی اور شو بی کسی قابل نہیں ہو جاتے۔“

”بیٹا! تنازعہ کون انتظار کرتا ہے بھلا؟“

”انتظار تو انہیں کرنا پڑے گا۔ اور اگر نہیں کر سکتے تو بے شک.....“

”کوئی غلط بات منہ سے مت نکالنا۔“ مای جی نے ٹوک دیا۔

”بہر حال۔ میں اپنے گھر کی ناؤ کو بیچ بھنور میں نہیں چھوڑ سکتی اور پھر ابو جی کے بعد اب اپنے لئے تو کوئی بات اچھی سوچی ہی نہیں جاتی۔ کہاں شادی کی بات۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ اور آنکھوں میں پانی اتر آیا جسے چھلکنے سے وہ روک نہ سکی۔

”بیٹا! مای جی نے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

”روتے نہیں ہیں۔ شاید میں نے قبل از وقت بات چھیڑ دی ہے۔ بہر حال وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم جا کر ہاتھ منہ دھوؤ۔ دیکھو تمہارے رونے سے تمہاری امی پریشان ہو رہی ہیں۔“

وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے اس نے سنا امی کہہ رہی تھیں۔

”اصل میں سب سے بڑی ہے ماں۔ باپ کے زیادہ قریب تھی۔ اور پھر حساس بھی بہت زیادہ ہے۔ میری بھی کوئی بات کرتی ہوں تو یونہی رونے لگتی ہے۔“

امی کو جس بات کا خدشہ تھا۔ اس کی ابتداء ہو گئی تھی۔ مای جی کے سامنے تو اس نے بات بنالی تھی لیکن زیادہ عرصہ تک اس طرح بات نہیں بنا کی جاسکتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ آج سب لوگ ہمدردی سے اس کی بات سن کر اس کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا

اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیل بجا کر چیز اسی کو بلایا۔ اور وہ لیٹر ہمدانی کے پاس ٹائپ کروانے کے لیے بھیج دیا۔ پھر اس کی طرف متوجہ ہوا تو کہنے لگا۔

”اب تو اعتراف کرنا! کسی پریشانی نے آپ کے کام میں خلل ڈالا ہے۔“

”میں اعتراف کر بھی لوں تو۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ اس سے کیوں کہے۔

”میں یہ دعویٰ تو نہیں کروں گا کہ آپ کی پریشانی دور کر دوں گا۔ لیکن کہہ دینے سے دل

کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“

”مجھے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کرنا۔“ پھر جیسے اپنے آپ سے بولی تھی۔

”بوجھ ہلکا ہو گیا تو معافی کے در کھل جائیں گے اور تمہارے لئے کوئی معافی نہیں۔“

”کمال ہے لوگ تو بھڑاس نکالنے یا بوجھ ہلکا کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں اور

آپ.....“

”میں بھی ایسا ہی کرتی ہوں۔ لیکن اپنوں کے سامنے۔“

وہ جو میز کی سطح پر کہنیوں تک بازو رکھے قدرے آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس کی

بات پر فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

”چلیے آج گھر جا کر اپنوں کے سامنے سارا بوجھ ہلکا کر لیجے گا تا کہ کل کام میں کوئی خلل

نہ پڑے۔“

”ایسا ہی کروں گی۔“ اس نے اعتماد سے کہا اور کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اب میں جاؤں؟“

”ضرور۔“ وہ اسے جاتے اور دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

شام کو گھر آتے ہی وہ واقعی امی سے الجھ پڑی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں سب کو بتا دینا

چاہئے کہ ہم نے آذر کے گھر والوں سے رشتہ توڑ لیا ہے۔

”آخر کیوں اور یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ امی پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

کے لئے کہا اور وہ جب اس کے سامنے بیٹھی تو اس پر نظر پڑتے ہی اس کے اندر ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہی..... وہ شخص ہے جس نے مجھے نفرتوں سے آشنائی بخشی۔ اس کی بدولت میں گزشتہ کئی ماہ سے سکون کے چند لمحات کو ترس رہی ہوں۔ اور اسی کی وجہ سے سچ میرے لئے سزا بن گیا ہے۔“

”مس عمر!“ وہ اسے متوجہ کر رہا تھا لیکن وہ اندر کے شور میں اس کی آواز سن ہی نہ سکی۔ بظاہر نظریں اسی پر مرکوز تھیں۔ لیکن ذہن اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر ہاتھ میں پکڑا کاغذ اس انداز سے اوپر اٹھایا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ وہ چونکی اور گھبرا کر اپنے اطراف میں دیکھنے لگی اور وہ یوں بن گیا جیسے اس وقت سے اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوا ہو۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی ہوگی۔ تب اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”آپ کچھ پریشان ہیں؟“

”نہیں۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

”کوئی پرابلم؟“

”نہ سرائے پریشانی نہ پرابلم بلکہ سب ٹھیک ہے۔“

”اگر سب ٹھیک ہے تو پھر یہ کیا ہے؟“ اس نے اس کا ٹائپ کیا ہوا لیٹر اس کی طرف

بڑھایا تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے کبھی اسے اور کبھی اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

”ایک نظر اسے دیکھ لیں۔“ اس نے کہا تو وہ کاغذ لے کر اس پر نظریں دوڑانے لگی۔

”یہ خدا اتنی غلطیاں!“ اندر ہی اندر خجالت محسوس کرتے ہوئے سوچا۔

”میں اسے دوبارہ ٹائپ کر دیتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی کہ اس نے رد کر دیا۔

”آپ بیٹھیں۔ میں یہ کام ہمدانی سے کروا لیتا ہوں۔“

”وقت آنے پر خود ہی سمجھ جاؤ گی کہ یہ سب کیا ہے۔ ابھی پلیز اس موضوع پر کوئی بات نہ کرو۔“

”نہیں زارا! آخر مجھے بھی تو پتا چلے کہ تم کیا کرنے جا رہی ہو۔“

”میں کچھ نہیں کر رہی۔ اب جاؤ اپنی جگہ پر۔ مجھے نیند آرہی ہے۔“

اسماء اٹھنا نہیں چاہتی تھی لیکن اسے کروٹ بدلتے دیکھ کر مجبوراً اپنی جگہ پر چلی آئی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ زندگی کافی حد تک معمول پر آگئی تھی۔ اور جہاں

اسے اپنے مقصد میں کچھ کامیابی ہوئی یعنی آذر اس کی طرف مائل ہونے لگا تھا۔ وہاں گھر میں بھی

ایک خوشگوار سا ہنگامہ جاگنے لگا تھا۔ تایا جی اپنے بیٹے نوید کے لئے اسماء کو مانگ رہے تھے۔ امی

شش و پنج میں تھیں۔ ظاہر ہے بڑی کی موجودگی میں چھوٹی کو نہیں بیاہ سکتی تھیں۔ لیکن تایا جی نے

اطمینان دلایا کہ جب تک زارا کی کہیں بات نہیں ہو جاتی وہ شادی کے لئے شور نہیں مچائیں گے۔

ویسے تایا جی کا خیال نوید کے لئے زارا کو مانگنے کا تھا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ نوید نے خود اسماء کا نام

لے دیا تھا۔ بہر حال ان کے لئے دونوں بھتیجیاں ایک جیسی تھیں۔ یوں گھر کی ایک چھوٹی سی

تقریب میں نائی جی نے اسماء کو انگوٹھی پہنادی۔

☆☆☆

”اگر آپ برائہ مانیں تو ایک ذاتی سوال پوچھوں؟“

اسے لیٹرڈ یکٹیٹ کرواتے ہوئے اچانک آذر نے کہا تو اس کا تیزی سے چلتا ہوا قلم

رک گیا۔ اور وہ سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”آپ انگلیج ہیں؟“ اس کے پوچھنے پر فوری طور پر جواب نہ دے سکی۔ اصل میں سمجھ

میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

”آپ شاید ماسٹر کر گئیں؟“

”نہیں تو۔“ وہ فوراً بولی۔

”اس لئے کہ کل مای جی کے سامنے میں نے بات بنا تو دی تھی لیکن اس کے بعد مجھے ایک پل کے لیے چین نہیں ملا۔ میں بار بار سب کو مطمئن نہیں کر سکوں گی۔ اس لئے آپ ایک ہفتہ بار سچ بول دیں۔“

”میں سچ بول دوں گی بیٹا! لیکن پہلے یہ تو دیکھنے دو کہ آذر کے گھر والے کیا چاہتے ہیں۔“

”وہ اگر کچھ چاہتے ہوتے تو آتے ناں۔ چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ ان کی طرف سے کوئی بھی نہیں آیا۔ اور آپ اب بھی کوئی امید رکھے ہوئے ہیں۔“

”بیٹا! انہیں گھربلنے کی اطلاع ہم نے خود نہیں دی۔ ہو سکتا ہے وہ تلاش میں ہوں۔“

”کوئی ایسا مشکل پتا نہیں ہے ہمارا۔ وہ اگر آنا چاہتے تو کسی سے بھی پوچھ کر آ سکتے

تھے۔ میرا خیال ہے آذر، تایا جی کا گھر جانتا ہے۔“

”ہاں۔ ایک بار تمہارے ابو جی کے ساتھ گیا تو تھا۔“ امی پر سوچ انداز میں بولیں۔

”بہر حال تم فکر مت کرو۔ اب کوئی تمہاری بابت پوچھے گا تو میں خود بات کر لوں گی۔“

”کیا بات کریں گی؟“

”یہی کہ ہم نے وہاں سے بات ختم کر دی ہے۔“

اسے امی جان کی بات پر اسی وقت مطمئن ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں اسے

اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے بہت کوشش کرنی پڑی۔ اور پتا نہیں وہ اپنی کوشش میں کامیاب

ہوئی بھی کہ نہیں۔

”زارا! میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم چاہتی کیا ہو؟“ رات میں اسماء حسب معمول سونے

سے پہلے اس کے بیڈ پر بیٹھی تو کہنے لگی۔

”ایک طرف تو تم امی کو مجبور کر رہی ہو کہ یہ رشتہ ختم کر دیں۔ اور دوسری طرف خود آذر

بھائی کے ساتھ ربط بڑھا رہی ہو۔ آخر یہ سب کیا ہے؟“

رشتہ داروں میں کارڈز تقسیم ہو چکے تھے، اور پھر گھر میں مہمان بھی موجود تھے۔ اسی وقت بات ختم کر دیتے تو پھر اتنے سارے لوگوں کو کیا جواب دیتے۔ مجبوراً ابو جی نے ہائی بھر لی۔ لیکن شاید ان سے انتظام نہیں ہو سکا تھا، جیسی ان کا اگلے دن ہارٹ فیل ہو گیا۔

”ویری سیڈ!“ وہ تاسف سے سر ہلاتا ہوا بولا۔

”آپ ہی بتائیے، کیا مجھے اس شخص سے شادی کرنی چاہئے جو میرے ابو کا قاتل

ہے۔“

”بالکل نہیں۔ اور کیا آپ نے اپنے فادر کی ڈچھ کے بعد اس سے رشتہ ختم نہیں کر

دیا۔“

”میں نے تو خیر اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اس سے شادی نہیں کروں گی۔ لیکن میری

والدہ شاید کچھ خوفزدہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زیادہ تر لوگ ہمیں ہی الزام دیں گے۔ اس لئے شش و

بچ میں ہیں اور صاف انکار بھی نہیں کر رہیں۔“

”اور وہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ان لوگوں نے تو ابو جی کے سوئم کے بعد سے ہمارے گھر میں جھانکا بھی نہیں۔ پتا

نہیں شرمندہ ہیں یا مایوس ہو گئے ہیں۔“

”شرمندہ کیا ہوں گے۔ ایسے ذلیل لوگ کبھی شرمندہ نہیں ہوا کرتے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ وہ اب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گزری باتوں

کا عکس تلاش کر رہی تھی۔

”آئی ایم سوری زارا! کہ میں نے یونہی ایک بات پوچھ کر آپ کو گزری ہوئی باتیں یاد

دلائیں۔“

”یاد تو ان کو کیا جاتا ہے جو بھول جائیں۔ اور میں تو کبھی بھولی ہی نہیں۔“

”آپ افسردہ تو ہوئیں؟“ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے پیز اور قلم اٹھالیا۔

”پھر میں نے کوئی اتنا مشکل سوال تو نہیں کیا، جو آپ سوچ میں پڑ گئیں۔“

”سوال تو مشکل نہیں ہے آذر صاحب! جواب مشکل ہے۔“

”ارے ایک ذرا سی ہاں یا ایک ذرا سی ناں کہنے میں کیا مشکل ہے۔“

”یہ دونوں باتیں ہیں۔“

”کیا مطلب ہے؟“

”یعنی انگیج ہوں بھی اور نہیں بھی۔“

”میں بالکل نہیں سمجھا۔“

”اصل میں، میں جس شخص کے ساتھ منسوب ہوں۔ اس کے ساتھ شادی نہیں کروں

گی۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ ایک لالچی انسان ہے اور اس کے لالچ ہی نے میرے ابو جی کی جان لے

لی۔“ وہ اس پر نظریں جما کر بولی۔

”ارے!“ وہ ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

”کیا ہوا تھا؟ میرا مطلب ہے، کیا کیا تھا اس نے؟“

”شادی سے صرف پانچ دن پہلے اس نے بھاری جہیز کا مطالبہ کر دیا۔ اس کی والدہ آئی

تھیں، کہنے لگیں، اگر جہیز میں فریج، ٹی وی اور واشنگ مشین وغیرہ نہیں ہیں تو ہماری طرف سے

بات ختم سمجھیں۔“

”آپ کے والدین کو اسی وقت بات ختم کر دینی چاہئے تھی۔“

اس کے کہنے پر وہ کچھ دیر ٹنٹولی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر کہنے

لگی۔

”میں نے بھی اس وقت یہی سوچا اور چاہا تھا۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا، کیونکہ تمام عزیز

”یہ باتیں تو جب بھی چھیڑیں گی، افسردہ ہی کریں گی۔ آپ لیٹر مکمل کر دے
ٹائپ کر دوں گی۔“

”میرا خیال ہے، اسے رہنے دیں، کل لکھوادوں گا۔“

”جیسے آپ کی مرضی!“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے
آئیں۔

”واقعی کمال شخص ہے۔“ رات میں وہ اسماء سے کہہ رہی تھی۔

”مجال ہے، جو میری کسی بات پر چونکا ہو۔ یوں انجان بنا رہا جیسے اس سارے
سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔“

اپنی بات کا رد عمل دیکھنے کے لئے اس نے اسماء کی طرف دیکھا تو وہ گم صم سی بیٹھی تھی
وہ متعجب ہوئی۔

پھر اس کا گھٹنا ہلا ڈالا۔

”اے تم کہاں کھوئی ہوئی ہو؟“

”میں آذر بھائی کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔“ اسماء اس کی طرف دیکھتے ہو
بولی۔

”میں حیران ہوں۔ لوگ اتنی جلدی کیسے بدل جاتے ہیں۔ آذر بھائی جب ہمار
ہاں آیا کرتے تھے، تو میں شوبی اور نومی ان کی شخصیت کے سحر میں کھو جایا کرتے تھے۔ ان کی بات
اور دھیمادھیمالہجہ بہت متاثر کن تھا۔ اور پتا ہے زارا! جب تم نے ابو جی کی موت کا ذمہ دار اپنے
ٹھہرایا تو مجھے بہت دکھ ہوا، میں نے سوچا آذر بھائی کبھی بھی ایسے نہیں ہو سکتے، اور اب تک میرا
تمہاری باتوں کی نفی کرتا آ رہا تھا۔ لیکن آج.....“ اسماء خاموش ہوئی تو وہ فوراً پوچھنے لگی۔
”آج کیا؟“

”آج شوبی بتا رہا تھا۔ اس کی آذر بھائی سے ملاقات ہوئی تھی، یوں ہی سر راہ۔“

”پھر؟“

”پھر شوبی کا کہنا ہے کہ وہ کچھ اکھڑے اکھڑے سے تھے۔ ڈھنگ سے بات بھی نہیں
کی۔ شوبی نے گھر آنے کے لئے کہا تو ٹال گئے، اور پھر کسی کام کا بہانا کر کے فوراً چلے بھی گئے۔“
وہ کچھ دیر تک جانے کیا سوچتی رہی پھر پوچھنے لگی۔
”شوبی نے یہ بات امی کو بتائی؟“

”ہاں اور امی کو بہت دکھ ہوا۔ وہ تو اب تک اس لگائے بیٹھی تھیں، اور پتا ہے زارا! ابھی
کچھ دن پہلے امی مجھ سے کہہ رہی تھیں۔ کہ زارا تو یونہی جذباتی ہو رہی ہے۔ میں خود کسی دن آذر
کے ہاں چکر لگا کر آؤں گی۔“

”کیا؟“ وہ دبی دبی سی آواز میں چیخی۔

”ہاں زارا! اور آئی ایم سوری، کہ میں نہ صرف امی کی بات سے متفق تھی بلکہ ان کے
ساتھ بھی جانا چاہتی تھی، لیکن آج جب شوبی نے آذر بھائی کے بدلے رویے کے بارے میں بتایا
تو.....“

”بہت خوب.....!“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”میں جواتے عرصے سے بکواس کر رہی تھی کہ وہ لالچی لوگ اب ادھر کا رخ نہیں کریں
گے۔ کیونکہ ابو جی کے ساتھ ہی ان کو بھاری جہیز ملنے کی امید ختم ہو گئی ہوگی، تو کسی نے یقین نہیں
کیا، اور آج شوبی نے دیکھ لیا تو.....“

”پلیز زارا! طنز مت کرو۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔“

اسماء واقعی نادم تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ دل تو چاہا خوب باتیں
سنائے، لیکن اس کی شکل ایسی ہو رہی تھی کی رحم آ گیا۔

”چلو اچھا ہے۔ کسی طرح تمہیں اور امی کو یقین تو آیا۔ اور اس سے اچھا یہ ہوا کہ امی
ان کے گھر نہیں چلی گئیں۔ پتا نہیں وہ لوگ کس طرح پیش آتے۔“

”اپنی امی کو سمجھائیں کہ آپ کبھی وہاں خوش نہیں رہ سکیں گی۔“ وہ فوراً اس کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔

”میں امی کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں، لیکن وہ شاید کچھ خوفزدہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر وہاں سے میری نسبت ٹوٹ گئی تو پھر شاید کبھی کوئی میرا ہاتھ تھامنے نہیں آئے گا۔“

”میں آتو گیا ہوں۔“ وہ بے اختیار کہہ گیا۔

”آذر صاحب! کہیں آپ مجھ سے ہمدردی کی بنا پر تو...“

”کم آن زارا!“ وہ فوراً بول پڑا۔

”ہمدردی کرنے کے لئے اور بہت لوگ ہیں۔“ اس کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگا۔

”پھر میں کب اپنی والدہ کو بھیجوں؟“

”ابھی نہیں، میں پہلے گھر میں آپ کا تذکرہ کر لوں پھر...“

”اوکے، لیکن ذرا جلدی۔“ اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”چائے چلے گی؟“ اس کے اثبات پر سر ہلانے پر انٹرکام پر چائے کے لئے کہا۔ پھر

اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔

”آج واقعی مجھے یقین آ گیا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میری والدہ گزشتہ پانچ برسوں سے میری شادی کے لئے کوششیں کر رہی ہیں، لیکن اتفاق دیکھئے کہ کہیں بات نہیں بنی۔ بعض جگہ تو مغلنی تک بھی ہو گئی، لیکن شادی کی

نوبت نہیں آئی۔“

”کیوں؟“

”پتا نہیں، میں خود نہیں سمجھ سکا کہ اچانک لڑکی والے بات کیوں ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن

”میں خود اس وقت سے یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں، اگر ہم ان کے

چلے جاتے اور وہ ہمیں صاف جواب دے دیتے تو کتنی بے عزتی ہوتی ہماری۔“

”فکر مت کرو۔ ایسی بے عزتی اب آذر کا مقدر ہو گئی ہے۔ شوبی کے بلانے پر

منول سے کام لے رہا تھا۔ دیکھنا سر کے بل آئے گا، وہ بھی سوالی بن کر اور خالی ہاتھ نہ لوٹا یا تو

نام بدل دیتا۔“

وہ دانت پیس کر کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

اس کی توقع کے عین مطابق آذر نے آفس آتے ہی اسے اپنے کمرے میں بلوا؛

اور جب وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی تو کہنے لگا۔

”کل یہاں سے جانے کے بعد میں سارا وقت آپ کے بارے میں سوچتا رہا۔“

”میرے بارے میں؟“ وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

”ہاں زارا۔“ آپ کے ساتھ جو سانحہ ہوا۔ وہ واقعی افسوسناک ہے اور یقیناً آپ

لوگوں سے متنفر ہو گئی ہوں گی۔“ اس کے سر جھکانے پر کہنے لگا۔

”لیکن۔ میں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کل جب میر

آپ سے پوچھا تھا کہ آپ کہیں انگریج تو نہیں تو میں آپ کا جواب نفی میں سننے کا خواہشمند تھا۔

ہیں کیوں؟“ وہ یقیناً جانتی تھی، لیکن اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

”میں آپ کو پردہ پوز کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے لئے یہ تعجب کی بات نہیں تھی پ

متعجب ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے صرف اتنا بولی۔

”آپ؟“

”ہاں! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔“

”لیکن سر، ابھی تو وہ معاملہ ختم نہیں ہوا، کیونکہ میری امی.....“

اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”تم کہاں آذر سے ملیں؟“

”میں۔“ وہ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے لمحہ بھر کو گڑبڑا گئی۔ اب کیا جواب دے۔

لیکن اب کچھ چھپانا بھی فضول تھا۔ اس لئے اصل بات بتادی۔ آخر میں کہنے لگی۔

”پہلے میرا مقصد اسے صرف سبق سکھانا تھا لیکن اب.....“

”زارا!“ امی نے نول دیا۔

”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا، اور اب پھر یہ کہہ رہی ہوں کہ جو ہوا سب بھول جاؤ۔

لوگ اسی طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ اور ہم کسی کی زبان نہیں پکڑ سکیں گے۔“

”لیکن میں آذر کی زبان ضرور پکڑوں گی۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تھی۔

پھر امی نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ وہ کسی طرح سے بھی اس سے متفق نہیں

تھیں۔ لیکن وہ شاید زندگی میں پہلی بار کسی بات پر اڑی تھی اور اس کی ضد سے مجبور ہو کر امی نے

ہتھیار ڈال تو دیے۔ لیکن جس روز آذر کو آنا تھا۔ اس روز امی اسما کو لے کر تایا جی کے گھر چلی

گئیں۔

آذر کے آنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ اس نے جلدی سے چائے کا پانی چوبے پر

رکھا، پھر ڈرائنگ روم میں آکر۔ بدبو کا تصویر کارز سے اٹھا کر بڑے صوفے کے عین سامنے رکھ

دی۔ اس کا خیال تھا کہ آذر دروازے سے داخل ہوتے ہی اسی صوفے پر بیٹھے گا اور وہ چاہتی تھی کہ

وہ بیٹھتے ہی اس تصویر کو دیکھ لے تاکہ اسے اپنا تفصیلی تعارف کرانے کی ضرورت نہ پڑے۔ نیل کی

آواز پردہ چوکی اور دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر پھیلاتی ہوئی آکر دروازہ کھولنے لگی۔

”ہیلو!“ اسے دیکھ کر وہ خوشدلی سے مسکرایا تو جواب میں وہ کوشش کے باوجود ہلکی سی

مسکراہٹ بھی ہونٹوں پر نہ لاسکی۔

”کیا یہیں سے بھیجنے کا ارادہ ہے؟“

اب میں سمجھ گیا ہوں ایسا کیوں ہوتا رہا۔“

”کیوں ہوتا رہا؟“

”اس لئے کہ آپ کو جو میری زندگی میں آنا تھا۔ اور ایک مزے کی بات بتاؤں، آخری

لڑکی جس سے میری منگنی ٹوٹی، اس کا نام بھی زارا تھا۔“

”اچھا!“ وہ اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

”اس سے منگنی کیوں ٹوٹی؟“

”وہ شاید کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ لیکن اپنے فادر کے ڈر سے خاموش رہی۔ جب اس

کے فادر کی ڈتھ ہو گئی تو اسے اپنی من مانی کرنے کا موقع مل گیا۔“

ایسے ہی خدشے کا اظہار امی نے بھی کیا تھا اور اس کے منہ سے یہ بات سن کر اس کے

ہونٹ بھیج گئے تھے۔ اور آنکھوں کی پتلیاں سکڑنے لگیں۔ اس سے اپنی کیفیت چھپانے کی غرض

سے وہ یونہی نیچے جھک گئی۔ جب سیدھی ہوئی تو چڑا اسی چائے لے کر آ رہا تھا۔ اس کے سامنے کپ

رکھا تو اس نے فوراً اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر چائے پیتے ہی اس کے کمرے سے ہی نہیں آفس

سے بھی نکل آئی۔ اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اگر کچھ دیر اور اس کے سامنے بیٹھتی تو یقیناً

اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر وہیں سارا حساب بے باق کرنے کھڑی ہو جاتی۔

اس کا خیال تھا گھر جاتے ہی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے چپ چاپ لیٹ جائے گی

لیکن امی کا سامنا ہوتے ہی ضبط جواب دے گیا۔ ان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔

”ارے کیا ہوا؟“ امی ایک م پریشان ہو گئیں۔

”آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ لوگ مجھے ہی الزام دیں گے کہ باپ کے مرتے ہی بیٹی نے

من مانی شروع کر دی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اور سب سے پہلے ایسی گھٹیا بات کہنے والا کوئی اور نہیں خود آذر ہے۔“

”آذر۔!“ امی کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی، پھر اسے کندھوں سے تھام کر

”تم وہ کیسے ہو سکتی ہو۔“

”کیوں، میں وہ کیوں نہیں ہو سکتی۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں وہی ہوں آذر احسان الحق۔ جس کی انگلی میں چھ ماہ تک تمہارے نام کی انگلی تھی پڑی رہی۔“

”لیکن تم نے تو مجھے اپنے بارے میں کوئی اور کہانی سنائی تھی۔“

”کہانی نہیں آذر صاحب! میں نے حقیقت بتائی تھی۔ میری زندگی کی سب سے تلخ حقیقت یہی ہے کہ شادی سے صرف پانچ روز پہلے تمہاری والدہ اور بہنیں جہیز کی لمبی لسٹ لے کر آئی تھیں، جنہیں پورا کرنا شاید ابو جی کے بس میں نہیں تھا۔ جی چپ چاپ چلے گئے بنا کچھ کہے۔“

”یہ سب جھوٹ ہے زارا!“ وہ اٹھ کر اس کی طرف آتا ہوا بولا۔

”ہماری طرف سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ یا پھر کسی نے یونہی۔“

”نہیں آذر! نہ کوئی غلط فہمی اور نہ ہی کسی نے بری نیت سے بہکانے کی کوشش کی۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ تمہاری والدہ فریجٹی دی اور واشنگ مشین کا مطالبہ کر رہی تھیں، اور تم اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو، کیوں جھٹلا رہے ہو اس حقیقت کو، تم بے خبر تو نہیں ہو گے۔“ وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا بے بس نظر آنے لگا۔

”ویسے تم کمال شخص ہو کہ اس روز میرے منہ سے اپنی حقیقت سن کر انجان بنے رہے۔ یوں جیسے میں تمہارے متعلق نہیں واقعی کسی اور کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔“ اس کے سر جھکانے پر کہنے لگی۔

”تم نے مشورہ دیا تھا ناں کہ ایسے ذلیل اور لالچی لوگوں سے رشتہ توڑنا ہی بہتر ہے۔ گو یہ فیصلہ تو میں خود بھی اسی روز کر چکی تھی۔ جس روز ابو جی تمہارے مطالبات کے سامنے زندگی ہار

”ارے نہیں!“ اس نے سامنے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا، پھر دروازہ بند کر کے اس کے ساتھ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔

”گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟“ وہ فوراً غیر معمولی خاموشی محسوس کر گیا تھا۔

”اصل میں ابھی کچھ دیر پہلے تایا جی نے پتا نہیں کس لئے بلوا بھیجا۔ امی میری چھوٹی بہن کو لے کر ان کی طرف گئی ہیں۔“

”پھر تو میرا بیٹھنا بیکار ہے۔“

”نہیں۔ آپ بیٹھیں، میں چائے لے کر آرہی ہوں۔“

”نہیں زارا! یہ مناسب نہیں لگتا، اور پھر مجھے تو آپ کی والدہ سے ملنا تھا۔“

”ہاں لیکن میں آپ کو چائے پیئے بغیر نہیں جانے دوں گی۔ بس میں ابھی لے کر آتی

ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد چائے لے کر واپس آئی تو وہ اس کی توقع کے مطابق ابو جی کی تصویر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ آہٹ پر چونکا اور سامنے اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”یہ تصویر کس کی ہے؟“ اس نے فوری طور پر جواب نہیں دیا۔ ٹرے میز پر رکھ کر، خود بھی وہیں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔

”یہ تصویر کس کی ہے؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”میرے ابو جی کی۔“ اطمینان سے جواب دے کر اس کی طرف دیکھا، اور اسے غیر یقینی سے اپنی طرف دیکھتے پا کر بظاہر سادگی سے پوچھنے لگی۔

”آپ جانتے ہیں میرے ابو جی کو؟“

”ہاں لیکن۔“ وہ شاید الجھ رہا تھا۔

”لیکن کیا؟“

وہ کچھ دیر تک ہلے ہوئے پردے کو دیکھتی رہی پھر پلٹ کر ابو جی کی تصویر پر نظریں جما دیں۔ ابو جی کی یہ تصویر جو ہمیشہ ہنستی مسکراتی ہوئی لگتی تھی۔ اس وقت کسی اور روپ میں ڈھل رہی تھی۔ اور وہ جوانی کا میاں پر خوش ہوئے جا رہی تھی۔ اندر ہی اندر سہم گئی۔

رات میں اسماء نے اس سے بہت پوچھا کہ اس نے آذر کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا لیکن اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔

”مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ کروٹ بدلنے لگی تھی کہ اسماء نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میں تمہیں ایسے سوئے نہیں دوں گی، آخر تم بتاتیں کیوں نہیں؟“

”میں نے صرف اسے اپنی پہچان کروائی تھی اور بس۔“

”اور ان کا رد عمل کیا ہوا؟“

”تم خود سوچ سکتی ہو۔“ اس نے جان چھڑائی۔

”ہاں سوچ سکتی ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ تم اتنی اپ سیٹ کیوں ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا

چاہئے کہ جو۔“

”میں خوش ہونا چاہتی ہوں۔“ وہ اسماء کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

”لیکن پتا نہیں کیوں اچانک میرا دل سہم گیا ہے۔ جیسے کسی جرم کی مرتکب ہوئی

ہوں۔“

”کسی کی دل آزاری جرم ہی تو ہے۔“

”ہاں لیکن۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا وہ کیا تھا؟“

”میں مانتی ہوں، ہمارے ساتھ اچھا نہیں ہوا، لیکن کیا یہ ضروری تھا کہ تم انتقام اس کے

ساتھ ایسا ہی سلوک کرو، کبھی کبھی معاملہ خدا پر بھی چھوڑ دینا چاہئے۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

گئے تھے۔ لیکن یہ انگلی۔“ اس نے بڑھ کر ریک پر سے انگلی اٹھائی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔

”یہ ہر دم مجھے احساس دلاتی ہے کہ اسے دینے والا میرے ابو جی کا قاتل ہے۔“ وہ ہونٹ بھیج کر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔

”لو اسے اور اب بے شک اپنی حقیقت چھپانے کے لئے لوگوں میں علی الاعلان کہتے پھرنا کہ باپ کے مرتے ہی بیٹی نے من مانی شروع کر دی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے انگلی اس کی طرف اچھال دی، جسے پکڑنے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی۔ بہت خاموشی سے انگلی کو اپنے پیروں میں گرتے دیکھا۔ کچھ دیر تک یونہی کھڑا رہا، پھر جب اس کی طرف دیکھا تو وہ پیٹھ موڑ چکی تھی۔

”میں اس وقت تم سے کچھ بھی کہوں، خواہ کتنی بڑی قسم کھا کر۔ تم میرا یقین نہیں کرو گی۔ اس لئے کہ تم اس وقت اپنے یقین کے زعم میں کھڑی ہو کہ جو تم کہہ رہی ہو، صرف وہی سچ ہے، اور زارا! اگر یہی حقیقت ہے جو تم نے کہی ہے تو بخدا مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ اور نہ ہی اب تک میرے علم میں ایسی کوئی بات آئی۔“

”میں تمہاری کسی بات کا یقین نہیں کروں گی، تم پلیز چلے جاؤ۔“ وہ اسی طرح رخ موڑتے ہوئے بولی۔

”یوں نہیں زارا۔ میری تذلیل کا جو طریقہ تم نے سوچا تھا۔ اس پر پوری طرح عمل کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہو، دفع ہو جاؤ۔“

”ہاں، ہاں۔ دفع ہو جاؤ۔“ وہ اس کی طرف مڑتے ہوئے زور سے چیخی۔

”تم میرے ابو جی کے قاتل ہو۔ کاش میں تمہیں دار پر چڑھا سکتی۔“

وہ اس کی آنکھوں سے پھوٹی نفرت کی چنگاریاں دیکھ کر افسردگی سے مسکرایا۔ اور ”پھر آؤں گا“ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

”زارا!“

اپنی صفائی میں کچھ کہنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہیں اپنے حالات سے آگاہ کر دوں۔ میں بہت چھوٹا سا تھا، جب میری والدہ کا انتقال ہو گیا، پھر کچھ ہی عرصے بعد یہ خاتون میری ماں بن کر آ گئیں۔ آج کے حالات کے پیش نظر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری دوسری ماں اگر اپنی کوکھ سے کسی بچے کو جنم دیتی تو میرے ساتھ اس کا رویہ خالص سوتیلی ماؤں جیسا ہوتا، لیکن شاید قدرت مجھ پر مہربان تھی کہ اس کی گود میں یکے بعد دیگرے چار بیٹیاں ڈال کر میری حیثیت اپنی جگہ برقرار رہنے دی۔ یوں اگر اس نے چاہا بھی ہوگا تو بھی دورانہیشتی سے کام لیتے ہوئے مجھ سے اپنا رویہ تبدیل نہیں کیا، جیسی تو آج تک میرے عزیزوں کے علاوہ کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ میری اپنی ماں نہیں ہیں۔

اور زارا! کل تک تو میں انہیں ایک مثالی ماں سمجھتا تھا۔ جنہوں نے اپنی اولاد سے زیادہ میرا خیال رکھا۔ اگر میں اپنی پوری زندگی پر نظر ڈالوں تو ایسا کوئی ایک لمحہ گرفت میں نہیں آتا، جب انہوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو۔ جیسی تو اپنے والد کے انتقال کے بعد میں، انہیں ہی اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھا، اور اپنی زندگی کا سارا اختیار ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

دو بہنوں کی شادیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد جب میں اپنے بارے میں سوچنے لگا تو ماں جی نے خوشی کا اظہار کیا اور اسی وقت سے میرے لئے لڑکی کی تلاش شروع کر دی، میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ کئی جگہ میری بات طے ہوئی اور پھر ٹوٹ گئی۔ میں اب تک اسے قسمت کا کھیل سمجھتا رہا۔ لیکن کل تمہارے ہاں سے آنے کے بعد جب میں حالات کے بارے میں سوچنے بیٹھا تو یہ مجھے قسمت کا نہیں ماں جی کا کھیل نظر آیا۔ اصل میں ماں جی چاہتی ہی نہیں ہیں کہ میں شادی کروں، کیونکہ وہ اندر سے خوفزدہ ہیں کہ آج کل تو اپنی سگی اولاد شادی کرتے ہی ماں بہنوں کو فراموش کر دیتی ہے، اور پھر میں تو ان کی سوتیلی اولاد ہوں، مجھ پر اگر انہوں نے اعتبار نہیں کیا، تو اس میں ان کا قصور نہیں ہے۔ حالات نے انہیں ایسا سوچنے پر مجبور کیا۔

”بہر حال جو کچھ تم نے کیا۔ اگر اس پر خوش نہیں ہو سکتیں تو پلیز آزر وہ بھی مت ہو۔“
اس نے ہلکے سے مسکرا کر سر ہلایا تو اسماء اس کا کندھا تھپکتے ہوئے اٹھ کر اپنی جگہ پر آ گئی۔

رات اسماء کے سونے کے بعد وہ بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ اس لئے صبح خود سے اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ امی نے دو تین بار اٹھایا لیکن وہ کسسا کر پھر سو گئی۔

”بیٹا! آفس نہیں جانا کیا؟“

”آفس۔“ اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر امی کی طرف دیکھا۔

”نہیں امی! اب کہیں اور جاب تلاش کروں گی۔“

”ٹھیک ہے پھر کچھ ملے آرام کر لو۔“

امی نے پھر اسے نہیں جگایا۔ وہ خود جب انھی تو دس بج چکے تھے۔ اسماء صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر دوپہر کے کھانے کے لئے سبزی بنا رہی تھی۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر اپنے لئے چائے بنائی اور مگ لے کر اندر آ گئی۔

”ناشتہ نہیں کرو گی؟“ امی اسے خالی چائے پیتے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ اس وقت کچھ سوچتا نہیں چاہتی تھی لیکن آپ ہی آپ گزری شام کا واقعہ یاد آنے لگا، اور ابھی وہ اپنا محاسبہ کرنے ہی لگی تھی کہ اسماء اسے پکارتی ہوئی آ گئی۔

”زارا! تمہارے آفس سے کوئی آدمی یہ لفافہ دے گیا ہے۔“

”کون تھا؟“

”بتا نہیں۔“ اسماء لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا کر چلی گئی تو وہ کچھ دیر تک یونہی سفید لفافے پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ جس پر صرف اس کا نام لکھا تھا، پھر اندر سے شدہ کاغذ نکال کر کھولا اور کچھ انجانائی اور کچھ جانی پہچانی تحریر پر نظریں دوڑانے لگی۔

ہوئے معافی کی نوید یا ایک عمر کی خلش۔

آذر

”آذر!“

ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ اس نے بیڈ کی پٹی پر سر ٹکا دیا۔

کچھ دیر بعد اسماء کمرے میں آئی تو وہ گم صم سی بیٹھی تھی۔

”زارا! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے نا۔“ اسے یوں گم صم دیکھ کر اسماء نے پریشانی سے

پوچھا، تو اس نے آذر کا خط اس کی طرف بڑھا دیا، جسے اس کے ہاتھ سے لیتے ہی اسماء جلدی جلدی پڑھنے لگی۔

”مجھے پہلے ہی یقین تھا۔ آذر بھائی کبھی ایسے نہیں ہو سکتے۔“ اسماء کو موقع مل گیا۔ اس کے سامنے گرنے کے انداز میں بیٹھتی ہوئی، قدرے جوش سے بولی تو وہ بے حد خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ کیا تمہیں اب بھی ان کا یقین نہیں آیا؟“

”پتا نہیں۔“

”تم پتا کرو۔ میں جب تک یہ خط امی کو دکھا دوں۔“ اسماء خط لے کر تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ تو وہ پھر سوچوں کے بھنور میں غوطے کھانے لگی۔

پھر سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ وہ بہتر فیصلہ کر سکے گی۔ لیکن جب دو دن گزر گئے اور اس نے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی تو سب اسے سمجھانے لگے۔

”زارا! کیا یہ آذر بھائی کی بڑائی نہیں ہے کہ انہوں نے کبھی ہمیں جب وہ ہمارے گھر آ کر بہت اپنائیت سے ہمارے درمیان بیٹھا کرتے تھے، نہیں بتایا کہ ماں جی ان کی سگی ماں نہیں ہیں۔“ اسماء قائل کرنے لگی۔

”اور وہ تو اب بھی یہ جاننے کے باوجود کہ ماں جی ان کے ساتھ دل سے فیئر نہیں

بہر حال میں نے اپنی چھوٹی بہن کو اعتماد میں لے کر اس سے تمہاری باتوں کی تصدیق کی، براہ راست ماں جی سے تصدیق یوں نہیں کی کہ میں نہیں چاہتا کہ بقیہ زندگی وہ میرے سامنے شرمسار رہیں۔ کچھ بھی سہی وہ مجھے پرورش کرنے کی سزاوار تو ہیں۔ اور یہ انہی کی تربیت ہے کہ آج میں زندگی میں اچھے مقام پر اعتماد سے کھڑا ہوں، ورنہ اگر وہ چاہتیں تو میری ہستی کو ریزہ ریزہ بھی کر سکتی تھیں اور پھر عورت ہر روپ میں میرے لئے قابل احترام رہی ہے۔ سرائٹھا کر بیٹے پر حکمرانی اک ماں کا حق ہے اور میں اسے دل سے تسلیم کرتا ہوں، اسی طرح بہنوں کے حقوق سے بھی نظریں نہیں چرا سکتا، اور رہی بیوی تو اس کے سارے حقوق، سارے مان اور تھوڑا زعم، محبتوں کے ساتھ پوری ایمانداری سے قبول کروں گا۔

اور تمہارے ساتھ جو سانحہ ہوا۔ اس کا مجھے دلی افسوس ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اسے بھولنا یقیناً تمہارے اختیار میں نہیں ہوگا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اپنا دل بڑا کر لو، اور سوچوں کو نیا رخ دے کر اس انداز سے سوچ لو کہ ماں جی نے جو بھی کیا۔ اس طرح کبھی نہیں چاہا ہوگا۔ ان کا خیال ہوگا، تمہارے ابو جی اسی وقت رشتہ ختم کر دیں گے۔ جیسا کہ پہلے کئی جگہ ایسا ہوا پھر بھی بخدا اگر مجھے ہمارا سا بھی شبہ ہو جاتا کہ اس روز ماں جی تمہارے گھر اس مقصد کے لئے جا رہی ہیں تو میں انہیں روک لیتا۔ میری بہن تم سے سخت شرمندہ ہے اور یقیناً ایک دن ماں جی بھی ہوں گی۔ میں اس دن کا انتظار تو کر سکتا ہوں، لیکن انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ کہ وہ ابھی اشک ندامت لے کر تمہارے در پر جا کھڑی ہوں، اور تم ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرو۔ ان کی طرف سے میں خود تم سے دست بستہ معافی مانگتا ہوں۔

اگر ہو سکے تو ہم سب کو معاف کر دو۔ ورنہ اگر جان کے بدلے جان چاہتی ہو تو میں حاضر ہوں۔ دیسے بھی اب زندگی بے معنی ہی لگنے لگی ہے۔ ہاں زارا! یہ اعتراف تو کر ہی لینے دو کہ دل و نظر میں سامنے والی تم پہلی اور آخری لڑکی ہو۔

ہر دو صورتوں میں تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔ مجھے ہر الزام سے بری کرتے

رہیں۔ انہیں وہی احترام دے رہے ہیں۔“ شوبی کہنے لگا۔

”ان کی جگہ کوئی اور ہوتا، بلکہ اگر میں ہی ہوتا تو اسی وقت اس عورت کو چھوڑ دیتا۔“

”شوبی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اتنا بڑا ظرف کسی کسی میں ہی ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ماں جی ان کی زندگی سے کھیل رہی تھیں، پھر بھی آذر بھائی نے نظر انداز کر دیا۔ تم بھی زارا پلینز انہیں معاف کر دو۔ اگر انہیں نہیں تو آذر بھائی کو تو معاف کر دو۔“

”آذر نے کیا کیا ہے جو میں اسے معاف کر دوں۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

”یہی بات آذر بھائی سے کہہ دو ناں۔ پلینز زارا!“

اسماء کے منت بھرے لہجے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تو اسماء نے مطمئن ہو کر نومی اور شوبی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آگے آذر بھائی خود اس سے بات کر لیں گے۔

اگلے دن وہ اپنا استعفیٰ لے کر آفس گئی تو سیدھی آذر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسے شاید اس کے آنے کی امید نہیں تھی۔ حیرت اور غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھا، اور پتا نہیں ارادنا یا غیر ارادی طور پر فوراً کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ؟“ فقط اتنا کہہ سکا، اور اس ایک لفظ نے اجنبیت کی جو دیوار کھڑی کر دی تھی، اسے وہ فوراً نہیں پھلانگ سکتی تھی۔

”جی وہ۔ میں یہ۔“ اس نے گڑبڑا کر لفاظی اس کی طرف بڑھا دیا۔ جسے لے کر وہ یونہی کھڑے کھڑے کھول کر دیکھنے لگا۔

”آپ بیٹھیں پلینز۔“ وہ بیٹھ گئی تو پوچھنے لگا۔

”جواب کیوں چھوڑ رہی ہیں؟“ اس نے جواب نہیں دیا تو کہنے لگا۔

”میری وجہ سے؟“

”نہیں تو۔“

”پھر کیا وجہ ہے؟“

”وجہ بتانا ضروری ہے کیا؟“

”اگر آپ نہیں بتانا چاہتیں تو میں مجبور نہیں کر سکتا۔“

اس نے تو بات ہی ختم کر دی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اسے فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے دیکھتی رہی، پھر بے اختیار پکار بیٹھی۔

”آذر۔“ وہ سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ کچھ پریشان سی اپنے آپ میں الجھتی ہوئی اچھی لگ

رہی تھی۔

”کچھ پریشان ہیں۔“ اس کے پوچھنے پر اعتراف کیا۔

”ہاں۔“ وہ فائل بند کر کے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آئی ایم سوری۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اپنی پریشانی کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیجے،

کیونکہ آپ تو صرف اپنوں کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کیا کرتی ہیں۔“

”اس وقت بھی میں کسی غیر کے سامنے نہیں بیٹھی۔“ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

”زارا!“

”ہاں آذر۔“ اس کی آنکھوں میں اچانک ڈھیر سا راپانی اتر آیا۔

”اس روز میں نے آپ کے ساتھ اچھا نہیں کیا، مجھے۔“

”وہ ایک فطری عمل تھا۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔

”یقین کریں۔ میں نے قطعی برا نہیں مانا تھا۔“

”یہ آپ کا ظرف ہے ورنہ آپ کی جگہ میں ہوتی تو.....“ وہ خاموش ہو گئی اور وہ ہنس

پڑا۔

”کیا کرتیں آپ؟“

”آپ کو شوٹ کر دیتی۔“

”تو کیا اب شوٹ نہیں کریں گی۔“

”نہیں۔ اب تو میں معافی کی نوید لے کر آئی ہوں۔ سب کے لئے۔ اور میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤں گی۔ کیونکہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن یہ کوشش ضرور کروں گی کہ جو ہوا اسے خدا کی رضا جان کر قبول کر لوں۔“

”شکر یہ زارا! پتا نہیں آپ کا بوجھ ہلکا ہوا یا نہیں، میرے دل کا بوجھ ضرور ہلکا ہو گیا ہے۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

”آپ کی اس بات سے کہ آپ کسی غیر کے سامنے نہیں بیٹھیں۔ میں یہ بات کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ میں ماں جی اور بہنوں کو نہیں چھوڑ سکتا، اور نہ کبھی چھوڑوں گا۔ لیکن آپ کے لئے شرعی احکام کے مطابق الگ گھر۔“

”نہیں آذرا! وہ فوراً بول پڑی۔

”جب عام معافی کا اعلان کر دیا تو پھر یہ تفریق کیوں۔ میں ماں جی کے ساتھ رہوں گی، ورنہ ان کے خوف کو یقین مل جائے گا کہ ایک لڑکی ان سے ان کا بیٹا چھین رہی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اب میں چلوں گی۔“

”میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ مجھے ماں جی کو بھی لینا ہے۔“

”کہاں سے؟“

”تمہارے گھر سے۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

”کیا مطلب؟“

”بھئی ماں جی اس وقت تمہارے گھر گئی ہوئی ہیں۔ تمہاری امی سے یہ پوچھنے کہ لوگ جو شادی کا رڈ پر کسی نئی تاریخ کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو کون سی تاریخ کا اعلان کیا جائے۔“

”کیا...؟“ حیرت سے منہ کے ساتھ آنکھیں بھی پوری کھل گئیں۔

”خاتونِ اول! آپ پلکوں کو تھوڑا سا جھکا لیجئے۔ ہو سکتا ہے کل ہی کی تاریخ ہو۔“

”بے ایمان۔!“ اس نے شرمیلیں مسکراہٹ کے ساتھ رخ موڑ لیا۔

☆☆☆

ہارے بھی تو بازی مات نہیں



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

وہ پچھلے دو گھنٹوں سے گل کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی مسلسل بحث کیے جا رہی تھی اور گل بھی کہاں ہار ماننے والی تھی دونوں اپنے اپنے موقف پر اس طرح ڈٹی ہوئی تھیں جیسے میدان جنگ میں سپاہی اپنے مورچوں پر ڈٹ جاتے ہیں۔

ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش میں اب تو ان کی آوازیں اتنی اونچی ہو گئی تھیں کہ اندر تک سنی جا رہی تھیں۔ اصل میں ابتداء ہی میں کسی بات پر اس نے کہہ دیا تھا کہ محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ اس پر گل نے فوراً اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

”غلط کہہ رہی ہو تم، محبت ہو نہیں جاتی بلکہ کی جاتی ہے۔“

”نہیں گل، یہ ہی ایک ایسا جذبہ ہے جس کے لیے باقاعدہ کسی پلاننگ کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ تو کسی بھی لمحے اچانک دل کے نہاں خانوں سے کسی چٹھے کی مانند پھوٹ نکلتا ہے۔“ وہ جانے کس خیال میں کھو کر بولی لیکن گل نے اس کا مذاق اڑایا۔

”تمہاری بات ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو یہ احمد جو دل ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں

اور اپنے آپ کو مجنوں، فرہاد وغیرہ کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔“

”نہیں گل! ہر انسان کی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب اچانک کوئی ان دیکھنے والی شخص پہلی ہی نظر میں دل کے تاروں کو یوں چھیڑ جاتا ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود دامن دل کو پھینکنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”سچ کہنا جو جی تمہارا وہ فضول سا منگیتر تمہیں پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا؟“ گل۔
ہستے ہوئے پوچھا تو اسے سچ سچ غصہ آ گیا۔

”دیکھو گل! بات تمہارے اور میرے درمیان ہو رہی ہے تم خواہ مخواہ بابر کی ذات نشانہ مت بناؤ۔“

”میرا مقصد بابر کو نشانہ بنانا نہیں تھا میں تو صرف یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ کیا وہ تمہیں پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔“

”ہاں۔“ اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا تو گل فوراً کہنے لگی۔

”اب دیکھو ناں! اگر تم ذرا سی پلاننگ کر لیتیں تو یقیناً کوئی خوبصورت سا بندہ تمہارا طلب گار بن جاتا۔“

”اس کا مطلب ہے تم محبت کے لیے باقاعدہ پلاننگ کرو گی؟“ اس نے بھی فوراً گل

بات پکڑی۔

”بالکل۔“ گل نے یقین سے گردن اکڑائی۔

”میں جب جس سے چاہوں گی محبت کروں گی۔“

”اور اگر تم پہلی ہی نظر میں اسیر محبت ہو گئیں تب.....؟“

”ایسا ناممکن ہے۔“ گل نے مضبوطی سے کہا۔

”میں اسے ناممکن نہیں سمجھتی ہو سکتا ہے یہاں سے اپنے کمرے میں جاتے ہو۔“

تمہارے ساتھ کوئی خوشگوار واقعہ پیش آ جائے اور تمہارے سارے دعوے اور دلیلیں دھری کی دھڑ

رہ جائیں۔“

”کیا بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو جو جی! اب میں اتنی بھی کمزور نہیں ہوں۔“

”بات کمزوری کی نہیں ہے گل! اصل قصہ یہ ہے کہ.....“

”بس جو جی! اب ختم کر داس قصہ کو۔“ گل نے اکتا کر ٹوک دیا اور اٹھنے لگی کہ اس نے

ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ پھر کہنے لگی۔

”پچھلے دو گھنٹوں سے ہم مغز ماری کر رہے ہیں اس کا کوئی نتیجہ تو نکلنا چاہیے۔ تم میری

بات سے اتفاق کر لو یا پھر مجھے قائل کر دو۔“

”تم قائل ہو نا نہ چاہو جو یہ احمد تو دوسری بات ہے ورنہ دوسروں سے قطع نظر اپنے

بارے میں میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ میں خواہ مخواہ محبت ہو جانے اور پہلی نظر کی محبت پر یقین نہیں رکھتی۔“ گل کی ہٹ دھرمی پر وہ اندر ہی اندر جھنجھلا کر بولی۔

”اور اگر کبھی تمہارے ساتھ ایسا حادثہ ہو گیا تب.....؟“

”میں اسے محض حادثہ سمجھ کر اگنور کر دوں گی۔“

”شرط لگا لو گل! تم ایسے کسی خوبصورت حادثے کو اگنور نہیں کر سکتیں۔ تمہیں شاید اندازہ

نہیں ہے ایسے چھوٹے چھوٹے حادثات بعض اوقات زندگی کا روگ بن جاتے ہیں۔“

”بن جاتے ہوں گے لیکن میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔“ گل نے کندھے اچکا کر

لا پرواہی سے کہا تو وہ گہری سانس کھینچ کر لان کی طرف دیکھنے لگی جہاں منو بھائی پودوں کو پانی دے

رہے تھے۔ اچانک ہی اس کی آنکھیں کسی خیال کے تحت چمکنے لگیں اور قدرے توقف سے وہ گل

کے بازو پر دباؤ ڈالتی ہوئی بولی۔

”سنو گل! ہم دونوں کی اسی بات پر ہو جائے شرط فیصلہ وقت کرے گا۔“

”مجھے منظور ہے۔“ گل نے بے نیازی سے کہا تو وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر

بولی۔

”اگر تم شرط بارگنیں تو تمہیں منوبھائی سے شادی کرنی ہوگی۔“

”اور اگر میں جیت گئی تب.....!“ گل نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا

تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”تب اپنے حسین منگیترا کو چھوڑ کر منوبھائی سے شادی تمہیں کرنی پڑے گی۔“ گل نے

کہا تو ایک لمحہ کو وہ نہ صرف شیشائی بلکہ جھرجھری بھی لی لیکن کیونکہ شرط اس کی طرف سے لگائی گئی تھی اس لیے انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں اثبات میں سر ہلایا تو گل زور سے ہنس پڑی۔

”اتنا بڑا قرار مت کرو جو جی۔“

”کیا مطلب؟“ اب واقعی وہ شیشائی۔

”بھئی شرط لگا رہی ہو تو ذرا دل بڑا رکھو لوگ۔ تو شرطوں میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں

اور تم ابھی سے ہمت ہارے دے رہی ہو۔“

”میں کیوں ہمت ہارنے لگی جب کہ مجھے اپنے جیتنے کا سو فیصد یقین ہے۔“ اس نے

یقین کے باوجود جانے کیوں اسے اپنی آواز دور سے آتی ہوئی لگی۔ اور گل نے اسی طرح ہنستے ہوئے بڑے جوش کا مظاہرہ کیا۔ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتھی ہوئی بولی۔

”ایسا اعتراف کرو جیسا میں کر رہی ہوں کہ اگر کبھی میں پہلی نظر میں محبت کر بیٹھی یا بنا

پلاننگ کے اچانک کوئی شخص میری نگاہوں میں آن سلیا تو میں سمجھوں گی کہ میں شرط ہار گئی اور اس کے لیے جو سزا تم نے منتخب کی ہے اسے بخوشی قبول کر لوں گی۔“ اپنی بات ختم کر کے گل کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کا ہاتھ ہلا کر بولی۔

”اب تم کہو۔“

”اگر میں شرط ہار گئی تو باہر کو چھوڑ کر منوبھائی سے شادی کر لوں گی۔“

”یہ ہوئی ناں بات۔“ گل زور زور سے اس کا ہاتھ ہلانے لگی اور بالکل غیر ارادی ط

پر دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ہٹ کر منوبھائی پر جا ٹھہریں۔ اور اس کی طرح لمحہ بھر کو ہی گل کا دل بھی کانپا جب ہی وہ فوراً اٹھتی ہوئی بولی۔

”چلو اندر چلتے ہیں۔“ اور وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ اور گل بچپن کی ساتھی تھیں۔ اس وقت جب اس نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا تب می کی انگلی تھام کر گیٹ سے باہر نکلتی تو گل اپنی می کے ساتھ اپنے گیٹ پر موجود ہوتی تھی۔ پھر می تو اپنی باتوں میں مصروف ہو جاتیں اور وہ اور گل اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کبھی ایک دوسرے کا فراک چھو کر دیکھتیں، کبھی ربن اور کبھی ناک۔

شروع شروع میں بس ایک دوسرے کو چھونے پر اکتفا کرتیں پھر رفتہ رفتہ ہاتھوں میں پکڑی چاکلیٹ کا تبادلہ ہونے لگا۔ اور اب تو سچ سچ ایک دوسرے پر جان دینے کی باتیں ہوتی تھیں گو کہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں اور سبکیٹ بھی ایک ہی تھے اس کے باوجود شام میں دو تین گھنٹے آرام سے بیٹھ کر جب تک ڈھیر ساری باتیں نہ کر لیتیں انہیں چین نہیں آتا تھا۔ گل اپنے گھر میں سب سے چھوٹی تھی اس سے بڑے دو بھائی اور ایک بہن تینوں شادی شدہ تھے بڑے بھائی تو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہیں رہتے تھے البتہ چھوٹے بھائی شادی کے چھ ماہ بعد بیوی کو لے کر الگ ہو گئے تھے جب کہ بڑی باجی اپنے ماموں زاد سے بیاہی ہوئی تھیں اور پچھلے دو سال سے اپنے میاں کے ساتھ قطر میں مقیم تھیں۔

اس گھر میں منوبھائی بھی مقیم تھے جو گل کے تایا زاد تھے۔ ان کے والدین بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ اس کے بعد گل کے ڈیڈی انہیں اپنے پاس لے آئے۔ گو کہ گل کی می بہت اچھی خاتون تھیں اس کے باوجود وہ منوبھائی کو وہ محبت نہیں دے سکیں جس کے وہ حق دار تھے۔ شروع ہی سے وہ نوکروں کے رحم و کرم پر رہے اور صحیح دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اکثر مختلف بیمار یوں کا شکار رہتے دس سال کی عمر میں انہیں پولیو ہو گیا تھا اور کچھ لا پرواہی کی بنا پر وہ اب کچھ اٹلڑا کر چلتے

تھے۔

شروع شروع میں جب وہ گل کے گھر جاتی تو منو بھائی کو دیکھ کر ڈر جاتی تھی۔ بے حد کمزور اور لاغر سے ایک بستر پر پڑے رہتے لیکن رفتہ رفتہ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسے کچھ کہیں گے نہیں تب دبے پاؤں ان کے پلنگ کے پاس سے گزرنے لگی اور منو بھائی نے کبھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جب بھی گل کے گھر جاتی وہ بس چپ چاپ اسے دیکھتے رہتے اور وہ ان کے دیکھنے کو نظر انداز کرتی ہوئی آرام سے گل کے ساتھ کھیلتی رہتی۔

یوں ہی ماہ و سال گزر گئے۔ وہ اور گل بچپن کی حدود سے بہت آگے نکل آئیں اور عمر کے اس سنہری دور میں بہاروں کے جانے کون کون سے روپ چرا لائیں تھیں کہ دیکھنے والے کو حیرت سے دیکھتے تھے اور بے نیازی ان کی عادت تھی۔ یا شاید دونوں ایک دوسرے میں اتنی مگن رہتی تھیں کہ کسی اور طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔

منو بھائی پرائیوٹ بی اے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اور کیونکہ اس نے کبھی ان کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی تھی اس لیے اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ پڑھنے اور امتحان دینے کس طرح جاتے ہیں وہ بس اتنا جانتی تھی کہ وہ گل کے کزن ہیں۔ اور جس وقت وہ گل کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر دنیا جہاں کی باتیں کرتی تو منو بھائی بیساکھی کے سہارے چلتے ہوئے ایک بار ضرور ان کے پاس سے گزرتے تھے۔ اگر وہ معذور نہ ہوتے تو شاید اپنی باتوں میں وہ کبھی دھیان ہی نہ دیتیں لیکن ان کی بیساکھی کی ٹنک ٹنک کچھ دیر کو انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے قریب سے گزرتے ہیں اس کے باوجود وہ زیادہ دھیان نہیں دیتی تھی۔

پھر اس وقت جب وہ انٹر کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی تو راولپنڈی سے بھیا کا بلاوا آ گیا اور وہ جانا بھی چاہتی تھی اور نہیں بھی کیونکہ اس نے گل کے ساتھ کتنے پروگرام بنا رکھے تھے بس امتحان ختم ہونے کا انتظار تھا۔ اب اگر وہ چلی جاتی تو گل کی ناراضگی یقینی تھی اور وہ اسے ناراض

نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن بھیا اور بھیا بھی کو بھی منع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ عجیب مشکل میں تھی کہ گل غالباً می کی زبانی سن کر اس کے پاس بھاگی چلی آئی۔

”تم پنڈی جا رہی ہو؟“

”نہیں تو۔“ وہ صاف مکر گئی۔

”جھوٹ مت بولو مجھے ابھی آنی نے بتایا ہے۔“

”کیا بتایا ہے؟“

”یہی کہ تمہیں بھیا اور بھیا بھی نے بلایا ہے۔“

”ہاں بلایا تو ہے لیکن میں نے ابھی جانے کے بارے میں نہیں سوچا۔“ اس نے قصداً بے نیازی دکھائی۔

”سوچنا بھی مت۔ اگر تم چلی گئیں تو میں یہاں کیا کروں گی۔“ گل نے باقاعدہ رعب جمایا تھا تو اچانک ہی ایک خیال سے وہ اچھل پڑی۔

”ہاں! یہاں تم کیا کرو گی چلو تم بھی میرے ساتھ چلو۔ دونوں چلتے ہیں ایمان سے بڑا مزہ آئے گا۔“

”لیکن میں کیسے جاسکتی ہوں؟“

”جیسے میں جاؤں گی۔“

”نہیں میرا مطلب ہے پتہ نہیں می اجازت دیں گی یا نہیں۔“ گل کے انداز میں آمادگی کے ساتھ اجازت نہ ملنے کا اندیشہ بھی تھا۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

”چلو آنی سے میں بات کرتی ہوں۔“

اور تھوڑی پس و پیش کے بعد گل کی می نے اجازت دے دی تو اسی وقت دونوں تیاری میں لگ گئیں۔ پھر اگلے روز ہی پاپا نے ان کی سینیٹس کرکسٹم کر دیاں۔ یوں اپنے بقیہ سارے پروگراموں کو آئندہ پرناٹا کر دونوں راولپنڈی آ گئیں۔

بھیا جانتے تھے کہ وہ دونوں گھوڑے پھرنے کی کتنی شوقین ہیں اس لیے اپنی گاڑی ان کے حوالے کر دی۔ ساتھ ہی تختی سے تاکید بھی کی تھی، ایک تو محتاط ڈرائیونگ کی دوسرے پنڈی سے آگے نہیں جانا اور ابھی وہ اتنی بڑی نہیں ہوئی تھیں کہ بھیا کی تاکید نظر انداز کر دیتیں۔

پھر چھٹی والے دن بھیا اور بھیا بھی خود ہی انہیں مری لے گئے۔ موسم کی جولانیاں عروج پر تھیں۔ وہ گل کا ہاتھ تھام کر اونچے اونچے پہاڑوں پر بادلوں کے سنگ چلتی ہوئی بہت دور نکل گئی، بھیا پیچھے سے پکارتے رہ گئے لیکن جب وہ دونوں اپنی باتوں میں مگن ہوئیں تو پھر کہاں کوئی آواز سنائی دیتی تھی۔ ایک پہاڑی سے نیچے اتریں تو ایک آدمی دو گھوڑے لیے کھڑا تھا۔ دونوں نے اشتیاق سے دیکھا تو وہ پوچھنے لگا۔

”بی بی سواری کرنی ہے؟“ تب ہی پیچھے سے بھیا اور بھیا بھی آگئے اور ان کا اشتیاق دیکھ کر بھیا فوراً کہنے لگے۔

”جوجی، بہت خطرناک سواری ہے پیچھے ہٹ جاؤ۔“

”نہیں بھیا! مجھے ڈر نہیں لگتا، ایک بار بیٹھنے دیں۔“ اس کے ساتھ ساتھ گل نے بھی ضد شروع کر دی، تب بھیا بھی کی سفارش پر بھیا نے انہیں ان کی مرضی پر چھوڑ دیا، تو گل نے گھوڑے کی لگام تھانے میں پہل کی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے بھیا کو دیکھا کہ کہیں وہ ناراض تو نہیں ہیں لیکن انہوں نے مسکرا کر اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھ کر دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گئی اور ابھی کوچوان انہیں ہدایات دے ہی رہا تھا کہ جانے کیا ہوا اس کا گھوڑا ایک بار زور سے اچھلا اور پھر سر پٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ پہلے تو خوب چیخیں، غالباً موت سامنے نظر آنے لگی تھی، یوں لگ رہا تھا کسی بھی لمحے اچھل کر کسی کھائی میں جا گرے گی۔

بڑی مشکل سے اپنے حواسوں پر قابو پا کر اس نے اپنے دونوں بازو گھوڑے کی گردن میں مضبوطی سے جکڑ لیے۔ پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا کوئی مدد کے لیے بھی آ رہا ہے یا نہیں ذرا سی

گردن موڑی تھی کہ اچانک اسے لگا وہ کہیں الجھ گئی ہے۔ گھوڑے کی گردن میں اس کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پھر کسی مضبوط حصار میں جکڑی وہ خشیب میں لڑھکتی چلی گئی، خوف سے آنکھیں بند کیے پہلا خیال یہی آیا کہ اب وہ کبھی اپنے گھر والوں کو نہیں دیکھ سکے گی۔

کتنی دیر بعد احساس ہوا کہ وہ زندہ سلامت کسی مقام پر رک چکی ہے۔ تب ڈرتے ڈرتے ذرا سی آنکھیں کھول کر اس نے دیکھا اف اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں جکڑے وہ جانے کون تھا جو اپنی بے حد خوبصورت، تسخیر کر لینے والی آنکھوں میں کچھ حیرت، کچھ اشتیاق لیے ایک نکل اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اور دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتی دھڑکنیں جانے کیا کہہ رہی تھیں کہ وہ بری طرح نروس ہو گئی۔ اور اس کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی تو وہ مسکرا کر بولا۔

”مجھے باہر کہتے ہیں۔“ پھر اسے چھوڑ کر کھڑا ہوا تو کہنے لگا۔ ”باہر نام کے لوگوں میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ کبھی مست ہاتھی کی زد میں آئے ہوئے بچے کی خاطر جان ہتھیلی پر رکھ لیتے ہیں اور کبھی کسی سرکش گھوڑے پر بیٹھی لڑکی کو بچاتے ہوئے خود زخمی ہو جاتے ہیں۔“

”آپ.....“ وہ ایسی ہی گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی، لیکن وہ کہیں سے بھی زخمی نظر نہیں آ رہا تھا پھر بھی پوچھ لیا۔ ”آپ کو کہاں چوٹ لگی ہے؟“

”یہاں.....“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ تو سن کر اس نے فوراً گھوم کر دیکھا گل بھیا اور بھیا بھی انتہائی پریشانی کے عالم میں بھاگے چلے آ رہے تھے وہ بھی بھاگ کر بھیا بھی سے لپٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔

”ارے کیا ہوا، ٹھیک تو ہونا؟“ بھیا بھی آہستہ آہستہ اسے تھپکنے لگیں۔ گل اس کے بازو میں چٹکی کاٹتی ہوئی بولی۔

”جان نکال کر رکھ دی تم نے ہماری۔“

”سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ آنسو پونچھتے ہوئے اس نے سارا الزام گل کے سر

رکھ دیا۔

اور اس رات جب وہ سونے کے لیے لیٹی تب اسے پتہ چلا کہ نیندیں پرانی کب اور کیوں ہوتی ہیں اور وجود جب کسی کی خوبصورت نگاہوں کے حصار میں قید ہو جائے تو دھڑکنوں کا انداز کیسے بدل جاتا ہے۔ وہ رات بھر اپنی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی رہی اور پلکوں نے تو جیسے ایک دوسرے سے نہ ملنے کی قسم کھالی تھی۔ نیم تاریکی اور سناٹے میں مسلسل اس کی سرگوشی سنائی دیتی رہی۔ پھر اس کے بازوؤں کا مضبوط حصار! وہ کروٹ پر کروٹ بدلتی رہی تھی۔

صبح گل نے پہلے حیرت سے اسے دیکھا، پھر شرارت سے پوچھا۔
 ”خیریت؟“

”کیوں کیا ہوا؟“ وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

”یعنی اب یہ بھی میں ہی بتاؤں۔“

”پتہ نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ نظریں چراتی ہوئی بولی تو گل نے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

”میری جان، تمہاری آنکھوں میں اتنی گلابیاں بہت سی ان کہی داستاںیں سن رہی ہیں جن میں مجھے ایک نام بڑا واضح نظر آ رہا ہے اور وہ ہے بابر.....“

”بابر..... بابر.....“ اس کی دھڑکنیں سچ سج راگ الاپنے لگی تھیں۔

”کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔“ گل نے اس کی ٹھوڑی چھو کر پوچھا۔

”نہیں، تم بھی غلط کہہ سکتی ہو بھلا۔“ پہلے ہی مرحلے پر اعتراف کرتے ہوئے وہ بری طرح جھینپ گئی اور گل کو اسے ستانے کا موقع مل گیا تھا۔ سارا دن لمبی لمبی آپہں بھرتی رہتی کبھی ذو معنی جملے اور کبھی ”مجھے خند نہ آئے“ جیسے گانے گاتی رہی وہ سخت پزل ہو رہی تھی۔ کتنی بار روٹھی بھی لیکن گل نے منالیا۔

اور شام میں جب وہ آیا تو اس کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ بے قراریاں اس کے

”میری وجہ سے.....؟“ گل نے آنکھیں دکھائیں تو بھانسی تو کتنی ہوئی بولیں۔

”بری بات! اب لڑ نہیں بلکہ شکر کرو کہ کوئی حادثہ نہیں ہوا۔“

”پہلے اس کا شکریہ ادا کریں، ہے کون وہ۔“ گل نے بابر کی طرف اشارہ کیا تو اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ بھیا اس سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔ پھر قریب آ کر بولے۔

”بھئی بابر یہ نٹ کھٹ لڑکیاں بد قسمتی سے میری بہنیں ہیں۔“

”کیا؟“ دونوں احتجاجاً چیخ پڑیں۔ اور بھانسی نے بھی ان کی طرف داری کی تو بھیا کو

صحیح کرنی پڑی۔

”خوش قسمتی سے میری بہنیں ہیں۔“ پھر بھیا اس کے بارے میں بتانے لگے۔

”یہ بابر ہے، میرا بہت پرانا دوست..... اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک ہم ساتھ پڑھے ہیں۔ پھر غم روزگار نے ہمیں جدا کر دیا۔ اور اب غالباً چار سال بعد ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔ چلو بابر باقی باتیں گھر چل کر کریں گے۔“

”کہاں مقیم ہو؟“ وہ بھیا سے پوچھنے لگا۔

”میں گزشتہ دو سالوں سے پنڈی میں مقیم ہوں۔ تم کہاں ہوتے ہو؟“

”اتفاق سے میں بھی پنڈی میں ہوں، لیکن مجھے آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“

”چلو پھر چلتے ہیں۔“ بھیا اسے لے کر آگے بڑھے تو ان تینوں نے بھی تقلید کی۔

یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سائے مجھے گھیر لیتے ہیں بانہوں کے سائے بھیا نے گاڑی اشارت کرتے ہی کیسٹ آن کر دی تھی اور وہ جو پہلے ہی خود کو اس کی نگاہوں کے حصار میں محسوس کر رہی تھی مزید زروں ہو کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ مناظر تو پہلے ہی حسین تھے اور اب تو جیسے ان کی دلکشی میں دو گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

وقت وہ اس سے یہی پوچھ رہا تھا کہ اس کا یہاں قیام کب تک ہے کہ گل آ کر کہنے لگی۔

”سنو جوجی ابھی تمہارے پاپا کا فون آیا تھا اور انہوں نے ہمیں واپس آنے کو کہا ہے۔“ وہ گل کی بات سن کر اسے دیکھنے لگی اور جیسے اسے اپنی بات کا جواب مل گیا تھا کچھ خاموش سا ہو کر دور آسمانوں پر نظریں دوڑانے لگا اور گل کو پتہ نہیں کوئی کام تھا یا قصداً انہیں تنہا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔
”تو قدرے توقف سے وہ جیسے اپنے آپ سے بولا
”تو تم جارہی ہو؟“

”ہاں۔“ وہ خواہ مخواہ ہنسی تو جو باتیں اتنے دنوں سے نہیں کہی جاسکتی تھیں وہ اچانک ہونٹوں پر آگئیں۔

”تم مجھے بہت یاد آؤ گی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تم نہ جاؤ۔“

”جانا تو ہے۔“ معاً اس سے دوری کے خیال سے وہ افسردہ ہو گئی تو کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

”میں چاہتا ہوں جو یہ جب تم یہاں سے جاؤ تو صرف میرا تصور ہی نہیں میرا تحفظ بھی ساتھ لے جاؤ۔“

”جی۔“ وہ نہیں سمجھی۔ تو وہ سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔

”میں تمہارے بھیا اور بھابھی سے بات کرنا چاہتا ہوں تمہارے لیے۔“ وہ خاصی نروس ہو کر سر جھکا گئی۔

”تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“ وہ اس کے نروس ہونے پر محظوظ ہو کر پوچھ رہا تھا کہ گل نے آکر شور مچا دیا۔

”ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔“ وہ شپٹا کر کھڑی ہو گئی اور گل کو گھورنے لگی جب کہ وہ اسی محظوظ انداز میں گل سے مخاطب ہوا۔

”تو آپ چوری چوری دوسروں کی باتیں بھی سنتی ہیں۔“

ایک انگ سے عیاں ہو رہی تھیں۔ بھیا اور بھابھی سے باتیں کرتے ہوئے متلاشی نظریں مسلسل ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ گل کتنی دیر تک نوٹ کرتی رہی۔ پھر اس کے پاس آ کر بولی۔

”وہ تمہارے لیے آیا ہے اور تم یہاں بیٹھی ہو۔“

”تمہیں کس نے کہا کہ وہ میرے لیے آیا ہے۔“ وہ قصداً انجان بن گئی۔

”اس کی ہر ادبیتا رہی ہے ہمیں تو لفت ہی نہیں کر رہا۔“

”اچھا۔“ وہ ہنس پڑی۔

”یہ بتیسی بعد میں نکالنا پہلے اس بے چارے کو اپنا دیدار کرادو۔“

”نہیں میں نہیں جاؤں گی۔“ اس پر گھبراہٹ سوار ہو گئی۔

”ارے واہ کیسے نہیں جاؤ گی۔“ گل اس کا ہاتھ پکڑ کر باقاعدہ کھینچتی ہوئی لاؤنج میں آئی

تو اس کے مایوس چہرے پر ایسی چمک لہرائی تھی کہ گل بھی حیران ہو کر دیکھنے لگی پھر اس سے سرگوشی میں بولی۔

”دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی ہے۔“

”تم کہاں تھیں جوجی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ بھابھی نے ٹوکا تو وہ جلدی سے ان

کے پاس بیٹھ گئی اور اس سے زیادہ اسے گل کی شوخ و معنی خیز نظریں پریشان کر رہی تھیں۔ کم بخت کو ذرا احساس نہیں تھا اس نے سوچ لیا کہ آئندہ اسے کوئی بات نہیں بتائے گی۔

پھر روزانہ ہی اس کی آمد ہونے لگی اور وہ تو پہلے مقام پر بار چکی تھی۔ زیادہ دن گریز بھی

نہیں کر سکی۔ پھر بھیا بھابھی کی طرف سے بھی ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ بڑے آرام سے سرشام لان میں آ کر اس کا انتظار کرتی اور وہ بھی سیدھا اسی کے پاس چلا آتا۔ گو کہ بہت سیدھے سادے

انداز میں رکی باتیں ہوتیں لیکن اس سب سے اس کی آنکھوں میں جو رنگ اترتے تھے انہیں وہ اپنے چہرے پر محسوس کرتی تھی۔ ایسے میں آرتھرائٹس، حاذی تو دونوں کو دیکھ کر شوخی سے ہنسنے سے باز نہیں آتی

تھی۔ پھر ابھی جذباتوں کو زبان نہیں ملتی تھی کہ کراچی سے ان دونوں کا بلاوا آ گیا۔ اتفاق سے اس

”سب کی تو نہیں صرف آپ کی۔“ گل نے بھی مزے سے جواب دیا۔

”صرف میری کیوں؟“

”اس لیے کہ معاملہ میری عزیز از جان دوست کا ہے۔“

”عزیز از جان دوست۔“ اس نے دہراتے ہوئے اسے دیکھا پھر گل سے پوچھا

لگا۔ ”پھر آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتی ہوں۔“

”ظالم سماج سے ٹکرا سکتی ہوں ویسے آپ بے فکر رہیں میرا خیال ہے آپ دونوں۔“

درمیان اس قسم کی کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ گل کی بے ساختہ ہنسی میں اس کی ہنسی بھی شامل ہو گئی تو اسے وہاں۔

بھاگنے میں عافیت نظر آئی۔

پھر اگلے روز واپس آتے ہوئے اسے لگا وہ بہت کچھ نہیں چھوڑے جا رہی ہے

بہت کچھ اس کے ساتھ ہے۔ یعنی گھانے کا سودا نہیں تھا اور اس کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی ایا

بل کو اس تو دوسرے بل ہونٹ مسکرانے لگتے۔

سارا دن می اس سے بھیا اور بھا بھی کا حال احوال پوچھنے کے ساتھ ان ہی کی بات

کرتی رہیں۔ شام میں وہ حسبِ عادت گل کے گھر چلی آئی تو اس روز پہلی بار منو بھائی نے اسے

سے مخاطب کر کے پوچھا تھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“

”بہت اچھی۔“ وہ انہیں سرہنری انداز میں جواب دے کر یا دوسرے لفظوں میں

نظر انداز کر کے اندر چلی آئی۔ گل خلافِ عادت کچن میں نظر آئی تو اس نے بر ملا حیرت

اظہار کیا۔

”یعنی تم اور یہاں۔“ جواب میں وہ ڈھٹائی سے ہنسی۔

”کبھی کبھی ایسا حسن اتفاق بھی ہو جاتا ہے۔“ گل نے مسکرا کر کہا۔

”کبھی کبھی کیوں روزانہ ہو تو بات بھی بنے ویسے کیا بنا رہی ہو؟“

”فرخ ٹوسٹ بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”کوشش۔۔۔۔۔“ وہ ہنستی ہوئی اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگی۔ تو

قدرے توقف سے گل معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”یہ میں خاص تمہارے لیے بنا رہی ہوں۔“

”اس مہربانی کا سبب پوچھ سکتی ہوں؟“

”ہاں میں نے سوچا اب تم پرانی ہو۔ زوالی ہو تو یہ جو کچھ وقت کا ساتھ ہے کیوں نہ

تمہاری خاطر مدارات کر لوں بعد میں یاد کر دو گی۔“ گل نے فرائی پین میں گھی ڈالتے ہوئے سبب

بتایا تو وہ جھینپ کر بولی۔

”ہٹو بے ایمان۔“

”بے ایمانی کی کیا بات ہے سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے باہر صاحب آجکل میں

تمہارے پیچھے بھاگے آئیں گے۔“

”مجھے ایسا کچھ نہیں لگتا۔“ وہ یوں ہی اٹھ کر ریک کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

”اے۔۔۔۔۔! ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو۔“ گل نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی

طرف موڑا تو کچھ حیران سی ہو گئی۔ دھنک رنگوں کی برسات میں بھیگا اس کا چہرہ ہمیشہ سے زیادہ

حسین لگ رہا تھا۔

پھر گل کا کہنا سچ ثابت ہوا۔ کچھ دنوں بعد ہی بھیا بھا بھی کے ساتھ باہر اپنے ڈیڑی کو

لے کر آ گیا اور کیونکہ بھیا اس کی پرزور سفارش کر رہے تھے اس لیے می اور پاپا نے انکار نہیں کیا اور

اگلے ہی دن بہت ساوگی سے باہر نے اس کی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنا دی۔

پاپا ابھی اس کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ابھی اس نے صرف انٹر کیا تھا۔ خود

اسے بھی پڑھنے کا شوق تھا اس لیے اس کے کم از کم بی اے کر لینے تک پاپا نے شادی کا کوئی ارادہ

”آپ سے بات کرنا فضول ہے۔“ وہ مایوسی سے سر ہلاتا ہوا اٹھ کر چلا گیا تو گل نے اسے دیکھ کر ”کیا ہوا“ کا اشارہ کیا اور وہ بے بسی سے بولی۔

”مجھے نہیں پتہ۔“

اب بھلا وہ کیا کر سکتی تھی جب مئی اور پاپاہی اس کی شادی کے حق میں نہیں تھے خود سے تو کہنے سے رہی اور اس کی خفگی بھی جان پر بنائے دے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے منایا۔

یوں ہی کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ مگنی کے چوتھے روز باہر واپس چلا گیا تھا اور اب اس سے صرف فون پر بات ہوتی تھی۔ اس کے اور گل کے معمولات وہی تھے۔ صبح ساتھ یونیورسٹی جانا ساتھ واپس آنا اور پھر شام میں برآمدے کی بیڑھیوں پر بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کرنا، کبھی فیورٹ اسٹارز، کبھی کھلاڑیوں کی باتیں اور کبھی یوں ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر شرطیں لگانا۔

ان کی شرطیں بھی بہت معمولی ہوتی تھیں یعنی جو ہارتا وہ جیتنے والے کو کوک پلاتا یا آئس کریم کھلاتا، لیکن اس بار شرط کڑی ہو گئی تھی۔ گوکہ اس شرط میں پہل اس کی طرف سے ہوئی تھی پھر بھی اسے لگا جیسے گل نے اس کی شہ رگ پہ ہاتھ رکھ دیا ہو۔ باہر سے دور ہو جانے کا تصور ہی اس کے لیے سوہان روح تھا جب کہ شرط ہارنے کی صورت میں اس سے دستبردار ہونا۔

اس رات وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتی رہی۔ کبھی خود سے الجھتی کہ آخر اسے ایسی شرط لگانے کی کیا ضرورت تھی اور کبھی خود کو بہلاتی کہ اسے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے گل یقیناً ہار جائے گی۔ اور ہار جیت کا فیصلہ تو وقت کو کرنا تھا۔

لیکن وہ ڈسٹرب ضرور ہو گئی تھی۔ خواہ خواہ کے واسطے اندیشے جن میں گھر کر وہ ہر وقت ہر جگہ گل کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ یونیورسٹی میں کسی بھی لڑکے سے بات کر رہی ہوتی، اس کی نظریں مسلسل اس کا جائزہ لینے میں لگ جاتیں۔ حقیقتاً وہ کسی ایسی بات کی منتظر تھی جو اسے گل کے ہارنے کی نوید دے اور پھر وہ اس اطمینان سے جی سکے کہ باہر کو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

ظاہر نہیں کیا بلکہ صاف لفظوں میں باہر کے ڈیڑی کو بھی بتا دیا اور اس نے سنا تو سیدھا اس کے پاس چلا آیا تھا۔

”یہ سراسر زیادتی ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ وہ اس کے آنے پر ہی بوکھلا گئی تھی اس کی بات کیا سمجھتی۔

”میرا خیال تھا میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ اور اس بار وہ اس کی بات سمجھ کر رخ موڑ گئی کیونکہ دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”سنو۔“ وہ قدم بڑھا کر سامنے چلا آیا۔ ”دو سال بہت ہوتے ہیں ایسا کرو بعد میں پڑھ لینا۔“

”بعد میں یہ صرف بچوں کی نگہداشت پر کتا میں پڑھ سکے گی۔“ گل اندر آتی ہوئی بولی تو وہ پہلے شیشیا پھر دانت پیس کر بولا تھا۔

”یہ آپ کہاں سے نازل ہو جاتی ہیں۔“

”میری چھٹی حس الارم بجاتی ہے کہ میری دوست کسی مشکل میں گرفتار ہے۔ بس میں فوراً اس کی مدد کو پہنچ جاتی ہوں۔“ گل نے گردن اکڑا کر کہا تو وہ گہری سانس کھینچ کر گرنے کے انداز میں وہیں صوفے پر ڈھمے گیا۔ پھر جیسے اچانک یاد آنے پر کہنے لگا۔

”سنیں گل! آپ نے تو کہا تھا کہ آپ ہماری خاطر ظالم سانج سے ٹکرا سکتی ہیں۔“

”کہاں ہے ظالم سانج! جلدی بتائیں۔“ وہ بالکل سنجیدہ نہیں ہو رہی تھی تب وہ اس کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”آپ کی دوست ہی ظالم بنی ہوئی ہیں۔“

”میں نہیں مانتی۔ یہ سب کچھ ہو سکتی ہے ظالم نہیں ویسے کیا ظلم کیا ہے اس نے۔“

”آنرز کرنا چاہتی ہیں۔“ اس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”یہ ظلم تو نہیں ہے۔“

”بابر کیسے ہیں آپ کہاں رہے اتنے دن مجھے فون کیوں نہیں کیا؟“ اس کی کھٹکتی آواز پر جہاں وہ ہنسا وہیں حیرت سے بولا۔

”آپ بھول رہی ہیں میڈیم ابھی پرسوں ہی میں نے فون کیا تھا۔“

”ادہ ہاں۔“ وہ خواہ مخواہ ہنس پڑی۔

”ایک بات بتاؤ جو جی تم اتنے دن کہاں کھوئی رہیں۔“ وہ ابھی بھی حیران تھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ سمجھی نہیں۔

”بھئی اتنے دنوں بعد آج تمہاری اصلی آواز سننے کو ملی ہے۔“ اس نے کہا تو اسے یاد آیا

کہ اتنے دنوں سے وہ خواہ مخواہ کے اندیشوں میں گھر کر کتنی پریشان رہی۔

”بس تھی ایک بات پھر کبھی بتاؤں گی۔“

”ابھی کیوں نہیں؟“

”بس ابھی نہیں۔“

”جیسے تمہاری مرضی لیکن سنو آئندہ خیال رکھنا۔ میرا مطلب ہے میں تمہاری ایسی ہی

کھٹکتی ہوئی آواز سننا چاہتا ہوں۔“ وہ ہنس پڑی۔

”خیال رکھوں گی اور کوئی حکم.....؟“

”حکم تو نہیں التجا کر سکتا ہوں کہ اب.....“

”اوں ہوں۔“ وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہے گا اس لیے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے

فون بند کر دیا اور می سے کہہ کر گل کی طرف آ گئی۔ اس کا خیال تھا اسے دیکھتے ہی گل ابھی کچھ دیر

پہلے پیش آنے والے خوبصورت حادثے کی بابت سب کچھ بتا دے گی لیکن وہ کوئی گھنڈہ بھر اس کے

پاس بیٹھی رہی اور اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ تب خود سے الجھتی ہوئی وہ اس کے پاس سے اٹھ

کر چلی آئی۔

اسے سچ مچ بہت دکھ ہو رہا تھا کہ گل نے ہار جانے کے ڈر سے نہیں بتایا یا کوئی اور بات

دوسری بات جو اس کے لیے پریشانی کا باعث تھی کہ اس روز کے بعد سے ارادی یا غیر ارادی طور پر اس کی نظریں منو بھائی کے آس پاس بھٹکنے لگیں پہلے جب وہ اس کے قریب سے گزر کر جاتے تھے تو وہ بالکل نظر انداز کر دیتی تھی اب ایسا لگتا جیسے اس کے کان ان کی بیساکھی کی ٹک ٹک سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ اس وقت تک وہ گل کی کوئی بات دھیان سے نہیں سن پاتی تھی جب تک منو بھائی ٹک ٹک کرتے قریب سے گزر نہ جاتے۔ پھر اپنی نظروں کو ان کے پیچھے بھٹکتا چھوڑ کر وہ گل سے باتوں میں مصروف ہو جاتی۔

☆☆☆

رات خوب بارش ہوئی تھی اور ابھی بھی آسمان پر بلکے بلکے بادل چھائے تھے۔ ناشتے کے بعد وہ میز پر آ کر بارش کے بعد نکھار دیکھنے لگی ہر شے دھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ ریٹنگ پر کہیاں ٹکا کر اس نے لان پر نظر ڈالی۔ پھولوں پر نوٹ کر نکھار آیا تھا۔ تازہ ہوا میں اس نے لمبے لمبے سانس لیے پھر گل کے گھر کی طرف دیکھنے لگی۔

چھٹی کا دن تھا اور اسے معلوم تھا کہ گل بارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھے گی اس نے سوچا وہ نہی جا کر اسے کہے اور اپنی سوچ پر عمل کی خاطر وہ ریٹنگ چھوڑ کر بیٹی ہی تھی کہ قدم رک گئے۔ اس نے دیکھا گل برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہی تھی اور اس کے ساتھ جانے کون تھا اور کیا کہہ رہا تھا کہ گل کے ہونٹوں پر خوبصورت دشرمیں مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

وہ نہ صرف ٹھٹھکی بلکہ اچانک دل کسی خیال سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ریٹنگ کا سہارا لیتے ہوئے اسے حیرت بھی ہوئی کہ اتنی دور سے وہ اس کے چہرے پر پھیلے قوس قزح کے رنگ دیکھ رہی ہے۔ دل چاہا بھاگتی ہوئی اس کے سامنے جا کھڑی ہو اور کہے تم شرط ہار گئیں لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی اور قدرے توقف سے ایک شوخ سا گانا گنگنائی ہوئی نیچے اتر آئی۔ ابھی آخری سیڑھی پر تھی کہ فون کی بیل جیسے اس کے ساتھ گنگنائے لگی۔ اس نے آ کر ریسور اٹھایا اور دوسری طرف بابر کی آواز سنتے ہی بے اختیار ہو کر بولی۔

تھی۔ بہر حال اس نے بھی سوچ لیا کہ وہ خود سے نہیں پوچھے گی۔ اور بہت سارے دن منتظر بھی رہی لیکن گل نے کوئی بات نہیں کی۔

۱۲۔ روز وہ اس کے گھر گئی تو پتہ چلا وہ کہیں گئی ہوئی ہے۔ وہ کھڑے کھڑے اس کی می سے بات کرے واپس آ رہی تھی کہ گیٹ پر منو بھائی کو دیکھ کر رک گئی۔ وہ کھڑے بھی تو اس انداز سے تھے جیسے راستہ رو کے کھڑے ہوں۔ اسے دیکھ کر ایک طرف ہٹنے کی بجائے چند قدم بڑھ کر اس کے سامنے آ گئے اور پوچھنے لگے۔

”آج آپ بہت جلدی واپس جا رہی ہیں۔“

”ہاں وہ گل نہیں ہے گھر پر۔“ وہ بولتے ہوئے کچھ رک گئی۔

”اور لوگ تو ہیں۔“

”جی میں سب کو سلام کر آئی ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ ذرا سامنے۔ ”مجھے تو نہیں کیا سلام یا آپ مجھے گھر والوں میں شمار نہیں

کرتیں۔“

”یہ کیسے سمجھ لیا آپ نے؟“

”میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے بات تو وہی سچ ہے جو میں نے کہی۔“ ان کا

بظاہر ہلکا پھلکا انداز تھا لیکن آواز میں پنہاں دکھ وہ محسوس کر گئی۔ پھر بھی انجان بن کر بولی۔

”پتہ نہیں آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ورنہ میں نے تو کبھی اس طرح نہیں سوچا۔“

”چلے آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔“

”شکریہ۔“ وہ کہتی ہوئی آگے بڑھی۔ پھر اچانک کسی خیال کے تحت رک کر

بولی۔ ”سین منو بھائی! آپ کو پتہ ہے گل کہاں گئی ہے؟“

”نہیں۔“ سیدھا سادا جواب تھا اور وہ قدرے طنز سے بولی۔

”کیوں کیا آپ اس گھر کے فرد نہیں ہیں۔“ ایک پل کو ان کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ پھر

سنجھنے کی کوشش میں غالباً ناکام ہو کر وہ پلٹ کر اندر چلے گئے تو وہ کندھے اچکا کر باہر نکل آئی۔

ایگزیم قریب آ رہے تھے۔ اس لیے وہ اور گل دیگر مشاغل چھوڑ کر سنجیدگی سے تیاری

میں لگ گئیں۔ ہر شام چھٹی دیر وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر باتیں کرتی تھیں وہی وقت اسٹڈی

کے لیے رکھ لیا اور برآمدے کی بجائے لان میں بیٹھنے لگیں۔ اگر ایسے میں منو بھائی پودوں کو پانی

دے رہے ہوتے تو جانے کیوں وہ ان کی طرف سے پیٹھ موڑ لیتی۔

اس روز موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا اور وہ دونوں کیونکہ جو پروگرام بناتیں اس پر سختی

سے عمل بھی کرتی تھیں اس لیے دل نہ چاہنے کے باوجود اپنے اپنے نوٹس لے کر لان میں آ گئیں۔

یہاں گلابوں کی مہک کے ساتھ ہلکی ہلکی پھوار نے بھی ان کا استقبال کیا تو گل نے اس کی طرف

یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو ”کیا پروگرام ہے۔“ جواب میں وہ اپنی فائل کھول کر بیٹھ گئی۔

”بہت بد ذوق ہوتم۔“ گل بیٹھی ہوئی پراسا منہ بنا کر بولی تو اس نے مسکراہٹ

چھپانے کی خاطر سر جھکا لیا اور قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”ایسے موسم بار بار آتے ہیں ہم کبھی بھی انجوائے کر سکتے ہیں۔“

”امتحان بھی تو بار بار آتے ہیں۔“

”حکومت میں ہرگز وقت ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں اور برائے مہربانی اب

فضول باتوں سے پرہیز کرو۔“ وہ بہت سنجیدگی سے ڈانٹ کر پڑھنے میں مصروف ہو گئی تو کچھ دیر

تک گل کی ہڑبڑاہٹ سنائی دیتی رہی پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ وہ یہی سمجھی وہ بھی پڑھنے لگ گئی

ہے۔ کتنی دیر بعد یوں ہی سراٹھا کر دیکھا تو چونک گئی۔ گل ایک ہتھیلی پر چہرہ نکائے جانے کیا سوچ

رہی تھی کہ اس کے ہونٹوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں چاہتوں

کے رنگ واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔

وہ پہلے حیران ہوئی پھر اچانک کسی خیال کے تحت ذرا سا مسکرائی اور اس کے ہاتھ پرا

ہاتھ رکھتی ہوئی دھیرے سے بولی۔

”کیسا خوف؟“ اس نے ٹھٹھک کر پوچھا تو گل کندھے اچکا کر بولی۔

”بابر سے دوری کا خوف‘ تم جانتی ہو ہماری شرط کی مدت ختم ہونے والی ہے اور ظاہر ہے ہارنے کی صورت میں تمہیں منوبھائی سے شادی کرنی ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ”میرا مطلب ہے میں ہاری نہیں ہوں۔“

”ہاری نہیں ہو تو ہار جاؤ گی‘ کیونکہ ابھی تک تو میرے ساتھ ”محبت ہو جاتی ہے۔“ والی حادثہ نہیں ہوا اور آئندہ بھی امکان نہیں ہے۔“ گل اب مکمل طور پر خود پر قابو پر کر اس کی حالت زار پر مسکرا رہی تھی۔ جس پر وہ الجھ کر بولی۔

”نہیں گل تمہارے ساتھ ایسا حادثہ ہو چکا ہے۔ ایک دو بار میں نے خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے۔“

”کیا..... کیا دیکھا ہے؟“ گل کی مسکراہٹ غائب ہو گئی لیکن وہ گھبرائی نہیں۔

”میں اسے جانتی تو نہیں لیکن وہ جو کوئی بھی تھا اس کے ساتھ چلتے ہوئے تمہارے چہرے پر ایسی ہی دھنک رنگوں کی بارات اتری تھی جیسی میرے چہرے پر دیکھ کر تم چونکی تھی۔“ اس کی بات سن کر گل کچھ دیر تک اس کی طرف یوں دیکھتی رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ وہ کس کی بات کہہ رہی ہے پھر گویا یاد آنے پر بولی۔

”شاید تم رازی کی بات کر رہی ہو؟“

”میں نے کہاناں میں اسے نہیں جانتی۔“

”تو اب جان لو۔“ گل نے خود کو نارمل پوز کرنے کی خاطر پہلے اطمینان سے چیز بیک سے کمر نکائی پھر اسے دیکھ کر کہنے لگی۔

”رازی میری باجی کا دیور ہے اور ان ہی کے ساتھ قطر میں مقیم ہے آجکل چھٹی پاکستان آیا ہوا ہے۔ ایک بار باجی کے گفتگو وغیرہ دینے آیا تھا۔ پھر باجی نے جو چیزیں یہاں

”سنوگل! تم شرط ہار گئیں۔“

”کیا مطلب؟“ گل نے بری طرح چونک کر دیکھا تو وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی بولی۔

”مطلب کو چھوڑ دے بتاؤ کون ہے وہ خوش نصیب جس کے تصور میں کھو کر تم یہ بھی بھول گئیں کہ تمہارے سامنے میں بیٹھی ہوں۔“

”پتہ نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟“ گل نے پہلو تہی کی کوشش کی لیکن وہ اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کر کے ایک دم بخیدہ ہو گئی۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو گل کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور اگر تمہیں یاد ہو تو میں نے بھی اس وقت ایسا ہی کیا تھا جب بابر میرے تصور میں آن بسا تھا اور یاد ہے جواب میں تم نے کیا کیا تھا۔“

”مجھے یاد ہے لیکن میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔“ گل نے نروٹھے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ اتنی سختی سے کہا کہ فوری طور پر وہ سمجھ نہیں سکی کہ آیا وہ سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ! کچھ دیر تک بغور اسے دیکھتی رہی۔ پھر یقین سے بولی۔

”دیکھو گل تمہارا اور میرا بچپن کا ساتھ ہے اور میرا خیال ہے ہم دونوں ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ اسی وقت تم غلط بیانی سے کام لو تو دوسری بات ہے ورنہ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ محبتوں کی راہ گزر سے تمہارے قدم نا آشنا نہیں رہے اور راہ گزر بھی ایسی جس پر چلنے کے لیے تم نے باقاعدہ کوئی پلاننگ نہیں کی۔ میرا مطلب ہے تم بنا پلاننگ کے ہی اس راہ پر بہت دور نکل گئی ہو ہے ناں۔“ گل کا چہرہ پیکا پڑ گیا لیکن پھر فوراً خود پر قابو پا کر کہنے لگی۔

”نان سینس! میں اتنی پاگل نہیں ہوں اور تم کس بنا پر اتنے یقین سے کہہ رہی ہو؟“

”تمہارا چہرہ اور تمہاری آنکھیں خود تمہارے اندر کا احوال بتا رہی ہیں۔“

”ہا..... ہا.....“ گل نے اس کا مذاق اڑایا۔ ”یہ تمہارے اندر کا خوف ہے جو جی جو تم

مجھ پر شک کر رہی ہو۔“

اس کے ساتھ بیٹھ کر پڑھائی نہیں ہو سکتی، جب کہ امتحان سر پر ہیں۔ اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ گل نے زیادہ اصرار نہیں کیا بلکہ اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو، ہم بجائے پڑھنے کے باتوں میں وقت برباد کرتے ہیں۔ خیر کچھ دنوں کی بات ہے پھر فراغت سے مل بیٹھیں گے۔“ اس نئی تبدیلی نے بھی اسے دکھ پہنچایا تھا۔

پھر اس نے چاہا اور بہت کوشش کی کہ کم از کم امتحانوں تک ہر بات ذہن سے جھٹک دے لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

اس شام بابر کا فون آیا اس وقت بھی وہ ایسی ہی ابھی ہوئی سی تھی۔ اس نے حال پوچھا اور وہ کہنے لگی۔

”پتہ نہیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“

”میں نے موسم کا حال تو نہیں پوچھا۔“ اس نے کہا تب چونک کر بولی۔

”کیا مطلب؟“

”بھئی میں تمہارا حال پوچھ رہا ہوں، خیریت سے تو ہونا۔“

”ہاں سب ٹھیک ہیں۔“

”یقیناً سب ٹھیک ہوں گے لیکن تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا تب وہ سوچ کر بولی۔

”اصل میں امتحان ہونے والے ہیں۔“

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ اگر تیاری نہیں ہے تو امتحان ہمت دو۔“ اس نے

بڑے آرام سے مشورہ دیا تو وہ فوراً بولی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“

”بس آپ اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں، میں امتحان ضرور دوں گی۔“ اس نے کبر کر

سے منگوائی ہیں ان ہی کی خریداری کے لیے میں اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ اب اگر اس کے ساتھ آنے جانے کو تم کسی اور نظر سے دیکھ رہی ہو تو یہ تمہاری اپنی سوچ ہے ورنہ میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں۔“

”سچ کہہ رہی ہو؟“ اسے اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود محسوس ہوا۔

”میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔“ پھر جتانے والے انداز میں کہنے لگی۔ ”ویسے رازی ہے اچھا، میرا خیال ہے اس سے محبت کی جا سکتی ہے۔ خیر میں سوچوں گی بلکہ باقاعدہ پلاننگ کروں گی۔“

وہ کچھ گم صم سے انداز میں اسے دیکھے گئی اور اسے اپنا یہ دعویٰ غلط لگ رہا تھا کہ وہ گل کی رگ رگ سے واقف ہے۔ وہ تو شاید اسے جانتی بھی نہیں تھی۔

”سنو۔“ گل نے اسے چونکا دیا۔ پھر کہنے لگی۔

”بھئی اگر تم اتنی ہی خوفزدہ ہو تو ہم شرط ختم کر دیتے ہیں۔“

”نہیں میں خوفزدہ نہیں ہوں۔“ اس نے کہا اور پھر اپنی کتابیں سمیٹ کر وہاں سے چلی

آئی۔

وہ واقعی خوفزدہ تھی اور اگر کوئی اور معاملہ ہوتا تو وہ اعتراف بھی کر لیتی لیکن اب تو جیسے انا کا سوال اٹھ گیا تھا۔ پھر اسے یقین تھا کہ جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا ہے وہی سچ تھا اور گل دھڑلے سے جھٹلا رہی تھی اور یہ سراسر دھوکہ تھا، وہ جتنا سوچتی تو اس کا دکھ بڑھ جاتا کہ گل اس کے ساتھ فاول کھیل رہی ہے۔ اگر وہ اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے شرط ختم کرنے کو کہتی تو وہ بڑے آرام سے اس کی بات مان لیتی کیونکہ اپنی جیت کا سہرا ہارنے والے کے سر پر سجانا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے لیکن یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا کہ ہار گئی تھی یا بار رہی تھی تو بجائے اعتراف کے اس پر احسان کرنا چاہتی تھی جو اسے گوارا نہیں ہوا۔

پھر اگلے کتنے دن اس نے گل کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ وہ بلائے آئی تو بہانا کر دیا کہ

فون بند کر دیا۔ پھر اپنے کمرے میں آتے ہوئے اچانک احساس ہوا کہ وہ اس سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کر سکی اور یقیناً اس نے بھی محسوس کیا ہوگا۔

”میں کیا کروں؟ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔“ وہ سوچتی اور کڑھتی بھی تھی۔

پھر امتحان شروع ہو کر ختم ہو گئے۔ جس روز وہ آخری پیپر دے کر آئی تو لمبی تان کر سو گئی۔ شام میں انھی تو کافی فریش تھی۔ شاور لینے کے بعد کچن میں آ کر چائے بنائی پھر کپ لیے ہوئے لان کی طرف جا رہی تھی کہ لاؤنج میں می کے ساتھ گل کو بیٹھے دیکھ کر اسی طرف آ گئی۔

”یعنی تم ہمارے سامنے بیٹھ کر چائے پیو گی۔“ گل اس کے ہاتھ میں ایک کپ دیکھ کر چیخی۔

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں تم بھی موجود ہو۔ خیر یہ تم لے لو میں اپنے لیے اور لے آتی ہوں۔“ اس نے صلح جو انداز میں کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ پھر اپنے لیے لے کر آئی تو گل اسے دیکھ کر بولی۔

”خوب سوئیں؟“

”ہاں۔ اتنے دنوں بعد مزے کی نیند آئی۔“

”مجھے تو سونا نصیب ہی نہیں ہوا، حالانکہ آج میرا پروگرام بھی یہی تھا کہ لمبی تان کر سوؤں گی۔“ گل نے کچھ بیزار سے انداز میں کہا۔ پھر چائے کا کپ خالی کر کے نمبل پر رکھا۔ اس کے بعد می کو دیکھ کر کہنے لگی۔

”اصل میں باجی کے دیور رازی قطر سے آئے ہوئے ہیں ناں! میں پیپر دے کر آئی تو کہنے لگے بازار چلو۔ انہیں اپنی منگیتر کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔“

”منگیتر.....!“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ وہ کچھ چونک کر گل کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بہت سیدھے سادے انداز میں می کو بتا رہی تھی۔ اس کے اندر سناٹا اترنے لگا۔ دھڑکنیں بھی مدھم ہو رہی تھیں۔ کتنی دیر تک می کو رازی کے بارے میں بتانے کے ساتھ اس کی منگنی اور

شادی کی باتیں کرتی رہی جن میں اس کا اپنا کہیں ذکر نہیں تھا اور اس نے صرف رازی کی منگیتر سنا تھا۔ اس کے بعد گل کی آواز تو آرہی تھی لیکن وہ کچھ بھی نہیں سن پا رہی تھی! جب گل نے اسے مخاطب کیا تب بھی وہ غائب دماغی سے اسے دیکھ گئی۔

”کیا سوچنے لگیں! چلو ناں باہر چلتے ہیں۔“ گل نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑا تب بھی وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں اس کے ساتھ کھینچتی چلی آئی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ لان میں آ کر گل نے باقاعدہ اسے جھنجھوڑا، تب وہ حواسوں میں آ کر خواہ مخواہ جھنجھلانے لگی۔

”کیا ہوا ہے مجھے ٹھیک تو ہوں تم یوں ہی میرے پیچھے پڑ جاتی ہو۔“

”ارے! ایسا کیا کہہ دیا میں نے جو تم ناراض ہونے لگیں۔“ گل نے تعجب کے اظہار کے ساتھ کہا، تب اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ رہی ہے۔ پھر قدرے نادم ہو کر بولی۔

”آئی ایم سوری، میرا سوڈ ٹھیک نہیں ہے۔“

”لگتا ہے بہت دنوں سے باہر کا فون نہیں آیا۔ یہی بات ہے ناں۔“

”شاید یہی بات ہو۔“ اس نے جھوٹ بولا ورنہ ابھی پرسوں ہی اس کا فون آیا تھا۔

”یعنی باہر کا غصہ مجھ پر نکالتی ہو۔ آنے دو اسے میں تمہارا غصہ اس پر نکالوں گی۔“ گل کے جوش میں آنے پر اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”بس بابا معاف کر دو آئندہ میں کم از کم تمہارے سامنے بہت محتاط رہوں گی۔“

”جاؤ معاف کیا اب یہ بتاؤ کہ کیا کرنا چاہیے۔“ گل نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

”کیا مطلب؟“

”بھی امتحان ختم ہو گئے اور مجھ سے گھر بیٹھا نہیں جائے گا۔ کیا خیال ہے جاب تلاش کریں۔“

میں پاپا کے ساتھ بابر کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ وہ ایک اچنتی نظر اس پر ڈال کر انجان بن گیا اور کھانے کے دوران بھی پاپا کے ساتھ ہی باتیں کرتا رہا۔ اسے پہلے ہی بھوک نہیں تھی۔ محض می پاپا کا خیال کر کے چلی آئی تھی اور اب بابر کو دیکھ کر تو بالکل ہی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بمشکل چند نوالے حلق سے اتارے اور می کے نوکنے کے باوجود اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

بابر کی اچانک آمد نہ صرف حیران بلکہ پریشان کن بھی تھی۔ پرسوں فون پر تو اس نے اشارہ بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس سلسلے میں آیا ہے حالانکہ اس سے جو نسبت اور جو ربط تھا اس حساب سے تو اسے فریش ہونا چاہیے تھا اور وہ خوش ہونا بھی چاہتی تھی لیکن گل کی باتوں نے اسے ایک پل کو بھی خوشی محسوس نہیں ہونے دی۔ عجیب مشکل تھی۔ وہ مسلسل اوٹ پٹانگ سوچتی رہی۔

صبح انھی تو رونے اور رات دیر تک جاگنے کے باعث آنکھیں سرخ اور پونے بھاری ہو رہے تھے۔ کتنی دیر تک ٹھنڈے پانی کے چھینے مارتی رہی، پھر بھی سرخی نہیں گئی۔ می پاپا کے ساتھ بابر کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔

اسے ڈر تھا کہ اگر می نے اس کے سامنے ہی اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا تو وہ بے اختیار رو پڑے گی۔ اور جتنا وہ اس سے بچنا چاہ رہی تھی ناشتے کے بعد وہ خود ہی اس کے کمرے میں چلا آیا۔

”السلام علیکم۔“ اس کے سلام کرنے پر وہ فوراً اس کی طرف پلٹی تو وہ جو ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ لیے کھڑا تھا تشویش۔ پوچھنے لگا۔

”تم ٹھیک تو ہو میرا مطلب۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ ٹوک کر قصداً مسکرائی، پھر پوچھنے لگی۔ ”آپ کیسے ہیں؟“

”تم نے ناشتہ نہیں کیا؟“ وہ اس کا سوال نظر انداز کر گیا۔

”دل نہیں چاہا۔“

”جواب۔۔۔۔۔!“ وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی اور قدرے توقف کے بعد نظریں جھکا کر بولی۔

”میں جواب نہیں کر سکتی۔“

”کیوں؟“

”تمہیں پتہ ہے دو سال پہلے جب میری مگنی ہوئی تھی اسی وقت بابر کے گھر والے شادی پر زور دے رہے تھے اور اب تو وہ بالکل نہیں رکیں گے۔“ اس نے اسی طرح نظریں جھکائے ہوئے سبب بتایا تو گل شرارت سے بولی۔

”تو تم پیادیس سدھار جاؤ گی۔“ پھر جیسے اچانک خیال آنے پر کہنے لگی۔ ”لیکن جو جی تم بابر سے شادی کیسے کر سکتی ہو؟ میرا مطلب ہے ہماری وہ شرط۔۔۔۔۔؟“

”اس شرط کی مدت غالباً ایک سال تھی۔“ وہ کھوئے ہوئے لہجے میں جیسے اپنے آپ سے بولی لیکن اس نے سن لیا اور بولی۔

”ہاں اور ایک سال ہونے والا ہے۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“ اس نے سہم کر دیکھا

”پھر یہ کہ میں شرط جیت گئی۔“ گل نے فاتحانہ انداز میں کندھے اچکائے۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ”اب بتاؤ می کو تمہارے گھر کب بھیجوں منوبھائی کے پرد پوزل کے ساتھ۔“

”گل۔“ وہ چکرا کر رہ گئی۔ اتنی بڑی بات اس نے کتنی آسانی سے کہہ دی تھی۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی پھر یک دم پلٹ کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ کر بند ہو گئی۔ آنسو بھی بے اختیار چھلک آئے تھے۔ دل چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روئے، پھر جا کر شرط ختم کرنے کے ساتھ گل سے بھی سارے ناتے توڑ ڈالے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکی چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔

رات میں می نے کھانے کے لیے بلوایا تب وہ کمرے سے نکل کر آئی تو ڈانٹنگ روم

”دل کیا چاہتا ہے۔“ وہ قدرے شوخی سے کہتا ہوا قریب آ گیا تو وہ گھبرا کر رخ مو گئی۔

”جو یہ کیا ہے میں صرف تمہارے لیے آیا ہوں۔ ادھر میری طرف دیکھ کر بات کر تمہیں کیا پریشانی ہے۔“ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور بڑی دقتوں سے بول پڑی۔

”نہیں تو مجھے کیا پریشانی ہوگی۔“

”یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ فون پر ٹھیک سے بات نہیں کرتیں اور ابھی بھی مجھے دبا کر تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی۔“

”آپ کے خیال میں مجھے خوشی کا اظہار کس طرح کرنا چاہیے۔“ اس کے پوچھنے جانے کیوں وہ خاموش سا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اسے پلٹ کر دیکھنا پڑا کہ آیا وہ موجود ہے یا جا چکا۔ اور اسے کھڑے دیکھ کر نجل سی ہو کر بولی۔

”آپ کھڑے کیوں ہیں بیٹھیں ناں۔“

”نہیں تم ناشتہ کر لو پھر کہیں باہر چلتے ہیں۔“ وہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ کچھ دیر شش و پنج میں کھڑی رہی۔ پھر ڈریس چھینج کر کے کمی سے کہنا ہوئی اس کے پیچھے چلی آئی۔ وہ گاڑی سے ٹیک لگائے منتظر کھڑا تھا اسے دیکھتے ہی دروازہ کھولا دیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”کہاں چلیں؟“ اس نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔

”کسی ایسی جگہ جہاں سارے خوف سارے اندیشے دم توڑ جائیں۔“ وہ جانے کو خیال میں گھر کر کھوئے ہوئے لمبے میں بولی تو وہ مر میں اسے دیکھنے لگا۔ ہمیشہ سے کتنی مختلف نظر رہی تھی نہ آنکھوں میں وہ چمک تھی نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور نہ چہرے پر دھنک رنگوں کا برسات..... وہ دھیرے سے پوچھنے لگا۔

”کن اندیشوں کی بات کرتی ہو اور تمہیں کس بات کا خوف ہے۔“

”میں.....“ وہ اپنے خیال سے چونکی۔ پھر گہری سانس کھینچ کر بولی۔ ”پتہ نہیں کیوں عجیب عجیب سے وابستہ ستانے لگے ہیں۔“

”میری موجودگی میں بھی۔“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور ذرا سارخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی ہر طرف زندگی رواں دواں تھی۔ روزگار کے لیے نکلے ہوئے لوگ اس وقت کتنے فریش نظر آ رہے تھے پھر وہ اس کا خیال کر کے سیدھی ہو بیٹھی اور سامنے سے کیسٹ اٹھا کر دیکھنے لگی لیکن اس سے پہلے ہی باہر نے پلیئر آن کر دیا۔ وہی دھیمی دھیمی موسیقی اور دھیمے دھیمے سر تھے۔

دھڑکتے ہیں دل آزاد یوں سے
بہت ملتے جلتے ہیں ان وادیوں سے
محبت کی رنگیں پناہوں کے سائے
مجھے گھر لیتے ہیں بانہوں کے سائے

یہ دل اور ان کی.....

کتنے خوبصورت لمحات نگاہوں میں آن سائے تھے۔ وہ سر سبز وادیاں وہ اس کی بانہوں کے حصار میں دھڑکنوں کا انداز بدلنا۔ پھر اس کی سرگوشی ”مجھے باہر کہتے ہیں“ اور شاید وہ اسے وہی لمحات یاد دلانا چاہتا تھا اور اب اس کی آنکھوں میں جھلملاتے عکس بہت اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

دل نے بہت اصرار کیا اسے چھیڑ کر دیکھے لیکن اس نے دل کا کہا نہیں مانا مبادا وہ پھر سے انجان بن جائے۔ سائل سے آتی نم ہوانے اس کے چہرے کو چھوا تب وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی اور اس وقت وہ قدرے انجان بن گیا۔ پھر ایک جگہ گاڑی روک کر اس سے پوچھنے لگا۔

”تم نے ناشتہ کیا تھا؟“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا تو دروازہ کھولتا ہوا بولا۔ ”چلو پہلے کچھ کھاؤ۔“

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

دھویں کی چادر تان کر بولا۔

”مجھ سے جھوٹ مت بولنا اگر کسی نے میری محبت کو دھندلا دیا ہے تو صاف کہو میں تم سے کوئی شکوہ کیے بغیر تمہاری دنیا سے بہت دور چلا جاؤں گا صرف تمہاری خوشی کی خاطر۔“

”بابر.....“ وہ ایک دم سناٹے میں آگئی۔

”میرا یقین کرو میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ بس مجھے اتنا بتا دو کہ.....“

”پلیز بابر.....“ اس نے انتہائی عاجزی سے ٹوک دیا۔ پھر بمشکل خود پر قابو پا کر کہنے لگی۔ ”آپ کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔“

”اور جو تم مجھے دکھ دے رہی ہو۔“

”میں نے کیا کہا ہے آپ سے؟“

”کچھ کہو ناں آخر کیا بات تمہیں پریشان کر رہی ہے۔“ وہ زچ ہو کر بولا تو وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر سر جھکا کر میز کی چکنی سطح پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے ہوئے گل سے لگائی شرط کا سارا احوال کہہ سنایا۔ پھر آخر میں کچھ ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد حیران تھا۔ بند منہ ہونٹوں پر جمائے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”آپ کچھ کہیں گے نہیں۔“ اس نے ایسے ہی ڈرتے ہوئے انداز میں پوچھا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ تم دونوں پاگل ہو۔“ اس کے ساتھ ہی ویٹر کو بلا کر بل پے کیا۔ پھر اٹھتا ہوا بولا۔

”چلو! گل سے تو میں ابھی نمٹتا ہوں آخر کیا سوچ کر اس نے یہ شرط لگائی۔“

”نہیں بابر۔“ وہ اس کے پیچھے آتی ہوئی بولی۔ ”آپ گل سے پتہ نہیں کہیں گے کیونکہ پہلے میری طرف سے ہوئی تھی۔“

”سٹ اپ! چلو بیٹھو۔“ وہ اس کے لیے دروازہ کھول کر خود ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ

”تمہارے دل کی ایسی کی تھیں۔ چلو اترو۔“ اس نے رعب سے کہا تو وہ کچھ روٹھی ہوئی سی اپنی طرف سے دروازہ کھول کر اتر گئی اور ایسے ہی انداز میں اس کے ساتھ ریٹینورنٹ میں داخل ہوئی۔

”موڈ ٹھیک کرو یوں لگ رہا ہے جیسے میں تمہیں زبردستی لایا ہوں۔“ وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا بولا۔

”تو اور کیسے لائے ہیں۔“ وہ کہہ کر گلاس وال سے پرے جھاگ اڑاتے سمندر کو دیکھنے لگی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تم میرے ساتھ آنا نہیں چاہتی تھیں؟“ وہ کچھ نہیں بولی تب اس نے پہلے ویٹر کو بلا کر چائے کے ساتھ سینڈوچز کا آرڈر دیا۔ پھر بہت خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب ویٹر چائے وغیرہ رکھ کر چلا گیا اور وہ پھر بھی متوجہ نہیں ہوئی تب اسے مخاطب کرنا پڑا۔

”جویریہ! چائے لو۔“ اس نے ایک نظر نیل پر ڈالی۔ پھر اسی خاموشی سے چائے بنا کر ایک کپ اس کے سامنے رکھ دیا اور اپنے کپ میں دھیرے دھیرے چچ چلانے لگی۔

”بس کرو چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ اس نے ٹوکا تب چچ رکھ کر اس نے سینڈوچ اٹھا لیا اور کھانے کے ساتھ گھونٹ گھونٹ چائے بھی پینے لگی۔ وہ اس کی غیر معمولی خاموشی اور بارکھو جانا بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اپنے طور پر سبب بھی سوچ رہا تھا۔

”سنو جویریہ!“ کتنی دیر بعد وہ اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں دو سال پہلے جب ہمارا انگیجمنٹ ہوئی تھی اس وقت تمہارے دل میں بھی میرے لیے ایسی ہی محبت تھی پھر وہ محبت ہوئی۔“

”جی۔“ وہ نا جھکی کے عالم میں دیکھنے لگی تو وہ سگریٹ کا گہرا کش لے کر درمیان

”ہاں ایک دو جگہ پلائی کیا ہے دیکھو کب کال آتی ہے۔“

”میرا مشورہ مانو جاب کا خیال چھوڑ کر شادی کا سوچو۔“ اس نے خود کو بہلانے کی خاطر ہلکا پھلکا موضوع چھیڑا اور گل نے اس کی بات پکڑ لی۔

”اس کا مطلب ہے تم شادی کرنا چاہتی ہو۔ میں آج ہی می سے بات کروں گی بلکہ ایسا کرو پہلے تم خود منو بھائی سے بات کرلو۔“

”کیا مطلب؟“ وہ جیسے سمجھ کر بھی نہیں سمجھی۔

”بھئی انہیں بتا دو کہ تم ان سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”لیکن میں تو ایسا نہیں چاہتی۔“ گل کے اتنے آرام سے کہنے پر وہ اندر ہی اندر تھلا کر بولی۔

”میں جانتی ہوں تم ایسا نہیں چاہتیں لیکن تم شرط ہار چکی ہو۔“ گل اتنے نارمل انداز میں بول رہی تھی جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو بالکل اسی طرح جیسے پہلے کبھی جیتنے کی صورت میں اس سے آئسکریم یا کوک کا مطالبہ کرتی تھی اب اس سے اس کا جیون مانگ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا باہر کی طرح اسے احمق اور پاگل کہہ کر وہاں سے چلی آئے اور کہنے جاری تھی کہ گل بول پڑی۔

”بھئی تم تو ابھی سے ڈانواں ڈول ہو رہی ہو میرا خیال ہے جانے وہ ہم اس شرط کو ختم کر دیتے ہیں بس تم یہ تسلیم کر لو کہ محبت ہوتی نہیں بلکہ کی جاتی ہے۔“

”نہیں محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی اور جو پلاننگ کے تحت کی جائے وہ محبت نہیں ہوتی۔“ وہ کہتی ہوئی انھ کھڑی ہوئی پھر جاتے جاتے رک کر بولی۔

”ابھی بھی میں ہاری نہیں ہوں بس یہ ہے کہ ہماری شرط کی مدت ختم ہو گئی اور نہ یاد رکھو منگل ہر انسان کی زندگی کو نیا موڑ دینے والا لمحہ ضرور آتا ہے۔ اور اس عرصے میں ایسا نہیں ہوا تو آئندہ کبھی تمہاری زندگی میں بھی ایسا لمحہ ضرور آئے گا تب تم میری بات سے اتفاق کر دو گی۔“

”ہو سکتا ہے لیکن ابھی تو ہماری ہار جیت کا فیصلہ ہو چکا۔“ گل نے کندھے اچکا کر جتایا

گیا۔ پھر اس کے بیٹھتے ہی گاڑی اشارت کر دی۔ وہ اس کے تیور بھانپ کر منت سے بولی۔

”پلیز ہار میری بات سنیں۔“

”مزید کیا سنانا چاہتی ہو؟“

”آپ بات نہیں سمجھ رہے یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ ہم نے بہت سنجیدگی سے شرط لگائی تھی۔ اگر آپ گل کے پاس گئے تو وہ سمجھے گی.....“ آنسو چھلک جانے کے باعث وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے روتے ہوئے دیکھا۔ پھر ہونٹ بھینچ کر سامنے متوجہ ہو گیا۔ کتنی دیر بعد جب وہ آنسوؤں پر بند باندھنے میں کامیاب ہو گئی تب کہنے لگی۔

”آپ کو میری قسم آپ گل سے کچھ نہیں کہیں گے۔“ وہ کچھ نہیں بولا لیکن بڑھتی ہوئی اسپید اور اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھوں کی مضبوط ہوتی گرفت اس کے اندرونی اضطراب کی غماز تھی۔ وہ جان گئی اگر اس نے مزید کچھ کہا تو وہ گاڑی کسی تیز رفتار بس سے ٹکرا دے گا۔ جیسی خاموشی اختیار کر گئی۔ اور جب گاڑی گھر کے سامنے رکی تب بھی چپ چاپ اترنے لگی کہ وہ رک کر بولا۔

”سنو میں شام کی فلائیٹ سے واپس جا رہا ہوں۔ تمہیں جب اپنی غلطی یا حماقت کا احساس ہو تو مجھے فون کر لینا۔“

”میں نے کوئی حماقت نہیں کی۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”ٹھیک کہتی ہو احمق میں ہوں جو تم جیسی پاگل لڑکی کے لیے دیوانہ ہو رہا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ ایک جھٹکے سے گاڑی بڑھا لے گیا وہ حیران کھڑی رہ گئی۔ پھر اپنے گھر جانے کی بجائے گل کے پاس چلی آئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں قالین پر اوندھی لیٹی فون پر جانے کس سے بات کر رہی تھی کہ اسے دیکھ کر فوراً ریسورر رکھ دیا۔ پھر اٹھ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

”میں ابھی تمہارے پاس آنے کا سوچ رہی تھی۔“

”تم نے سوچا اور میں آ گئی۔“ وہ اس کے پاس قالین پر بیٹھ گئی۔ پھر پوچھنے لگی۔

”تمہاری جاب کا کیا ہوا؟“

نہیں تھے۔ دکھ سے بولے۔

”میں بھلا آپ کے کس کام آسکتا ہوں۔“

وہ فوراً کچھ نہیں بولی بس اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی گئی اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔
 سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ ایک ذرا سی بات کیسے انا کا سوال بن گئی تھی۔ اسے یاد آیا بہت پہلے اس کے پاس ایک بہت خوبصورت گڑیا تھی اور ایسے ہی کسی بات پر شرط لگاتے ہوئے گل نے کہا تھا کہ اگر وہ ہار گئی تو گڑیا اسے دے دے گی۔ اس نے جوش میں ہائی تو بھری لیکن پھر دو دن تک اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اپنی اتنی پیاری گڑیا گل کو دینے کا خیال اسے پریشان کرتا رہا تھا بلکہ ایک دو بار تو وہ چپکے چپکے روئی بھی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ شرط جیت گئی تو وہ جو گڑیا چھن جانے کا خوف تھا اس سے نجات پا کر اسے یوں لگا تھا جیسے وہ پھر سے زندہ ہوئی ہو۔ کتنی خوش ہوئی تھی وہ۔
 ”جویریہ۔“ منوبھائی کے پکارنے پر وہ اپنے خیال سے چونک کر انہیں دیکھنے لگی تو وہ کچھ الجھ کر بولے۔

”آپ یہاں کیوں آئی ہیں میرا مطلب ہے میرے کمرے میں۔“

”بس یوں ہی۔“ وہ افسردگی میں گھر کر بولی اور ست روئی سے دوبارہ اسی جگہ آ بیٹھی تو منوبھائی پریشان سے ہو گئے کہ آخر وہ ان سے کیا چاہتی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آیا تو پوچھنے لگے۔
 ”آپ چائے پیئیں گی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا اور قدرے توقف سے خود پر قابو پا کر بولی۔

”میں تو بس یہ دیکھنے آئی تھی کہ آپ سارا دن کمرے میں بند ہو کر کیا کرتے رہتے ہیں۔“

”مجھے کیا کرنا ہے، کبھی پڑھ لیتا ہوں کبھی لکھ لیتا ہوں۔“

”کیا لکھتے ہیں؟“ اس کی حیرت میں چھپے تجسس کو محسوس کر کے وہ ذرا سا مسکرائے پھر آ کر اپنے پنک پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

تو وہ سمجھ کر اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

”ہاں۔ میں ہار چکی ہوں اور سزا کے لیے منوبھائی کے پاس جا رہی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ ڈرائنگ روم سے نکل آئی۔ قدم من بھر کے ہو رہے تھے پھر بھی وہ لاؤنچ سے گزر کر راہداری کے آخری سرے تک چلی آئی اور بہت آہستہ آہستہ سے دروازے پر دستک دی تو اندر سے منوبھائی کی آواز آئی۔

”کون ہے آ جاؤ۔“ اس نے بینڈل پر ہاتھ رکھ کر دروازے کو دھکا دیا پھر اندر داخل ہوئی تو منوبھائی اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

”آپ.....؟“

”جی السلام علیکم۔“ اس نے گھبرا کر سلام کر دیا۔

”وعلیکم السلام گھر میں اور کوئی نہیں ہے کیا؟“ جواب دینے کے ساتھ ہی انہوں نے پوچھا تو وہ آہستہ سے بولی۔

”سب ہیں۔“

”پھر.....؟“ ان کی حیرت میں کمی نہیں آرہی تھی بلکہ اس کے جواب پر مزید بڑھ گئی۔
 ”پھر یہ کہ میں آپ کے پاس آئی ہوں اور اگر آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا تو چلی جاتی ہوں پھر کسی وقت آ جاؤں گی۔“ وہ کہہ کر جانے لگی کہ انہوں نے روک دیا۔
 ”نہیں آپ بھگیں۔“

”شکریہ۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر ایب رسی پر قدرے تکلف سے بیٹھ گئی تو وہ کہنے لگی۔

”کوئی کام ہے تو بتائیے۔“ اس کے اندر جوار بھانا اٹھنے لگا۔ جو شخص اپنا کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتا وہ اس سے کام پوچھ رہا تھا ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آن ٹھہری اور بالکل غیر ارادی طور پر نظریں ان کے چہرے سے پھسلتی ہوئی جیسا کھی پر جا ٹھہریں اور وہ نادان

”مضامین اور افسانے وغیرہ۔“

”آپ میرا مطلب ہے آپ؟“

”مجھ جیسا بندہ یہی کر سکتا ہے ویسے آپ کو میرے لکھنے پر اتنی حیرت کیوں ہو رہی

ہے۔“

”حیرت آپ کے لکھنے پر نہیں بلکہ اس بات پر ہو رہی ہے کہ آپ نے کبھی بتایا نہیں۔“

وہ اندر ہی اندر خود کو سرزنش کرتی ہوئی بولی۔

”پہلے کبھی آپ نے پوچھا ہی نہیں۔“

”کب سے لکھ رہے ہیں؟“ وہ ان کی بات قصداً نظر انداز کر گئی۔

”مجھے خود یاد نہیں کہ میں نے کب لکھنا شروع کیا۔“ وہ جانے کس خیال میں گھر کر

بولے۔

”کس بات نے آپ کو لکھنے پر اکسایا تھا؟“

”شاید دل پر پڑنے والی پہلی چوٹ نے۔“ پھر خود ہی چونکے اور اسے دکھ کر مسکرا کر

پوچھنے لگے۔ ”کیا آپ میرا انٹرویو کر رہی ہیں؟“

”یہی سمجھ لیں۔“ وقتی طور پر وہ اپنی پریشانی بھلا کر اک نئے تجسس میں گرفتار ہو گئی تھی۔

”پھر تو مجھے خاموش ہو جانا چاہیے کیونکہ میں اپنے آپ کو خود سے بھی پوشیدہ رکھتا

ہوں۔“

”کیوں.....؟“ اس نے فوراً پوچھا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب وہ اپنی

جگہ سے اٹھ کر ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”بتائیں ناں منو بھائی! میں کون سا باقاعدہ آپ کا انٹرویو چھاپنے جا رہی ہوں۔“

”کوئی اور بات کریں؟“

”اور کیا بات کروں۔“

☆☆☆

”بہت ساری باتیں ہیں چلئے وہ بات کہہ دیں جو آپ کو میرے کمرے تک لائی ہے۔“ انہوں نے انجانے میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ کچھ دیر تک بے دھیانی میں انہیں دیکھتی رہی۔ پھر کچھ کہے بغیر ان کے کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

اس کا خیال تھا بابر محض اسے دھمکی دے گیا ہے کہ وہ شام کی فلائٹ سے واپس چلا جائے گا لیکن وہ سچ چلا گیا۔ جانے سے پہلے فون تک نہیں کیا جس سے ظاہر تھا کہ وہ ناراض ہو گیا ہے اور اس کی ناراضگی کو شدت سے محسوس کرنے کے باوجود وہ اسے فون نہیں کر رہی تھی حالانکہ دل اصرار کر رہا تھا اور کتنی بار وہ فون تک آئی بھی لیکن یہ سوچ کر باز رہی کہ جانے وہ کیا سمجھے۔

اپنے تئیں وہ یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ گل سے ہار کر وہ اپنی محبت ہار چکی ہے اور کیونکہ اب اسے منو بھائی سے شادی کرنی ہے اس لیے بابر کو فون کر کے وہ اسے کوئی آس نہیں دلانا چاہتی تھی۔ حالانکہ خود اس کی اپنی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ حد درجہ بیزاری چھائی ہوئی تھی جیسے دنیا میں اب اس کے لیے کچھ رہا ہی نہیں۔

اس شام اپنے کمرے سے نکلی تو مٹی کے ساتھ گل کی مٹی کو بیٹھے دیکھ کر اتنی خوفزدہ ہوئی کہ اگلے پیروں پیچھے ہٹنے لگی۔ غالباً پہلا خیال یہی آیا کہ وہ منو بھائی کا پروپوزل لے کر آئی ہیں۔ ”جو جی۔“ مٹی کے پکڑنے پر اس کے پیچھے ہٹنے قدم رک گئے اور حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔

”جی مٹی۔“

”بیٹا ذرا چائے بنا دو۔“ مٹی اس سے کہہ کر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئیں اور وہ ایسی ہی سہمی ہوئی سی کچن میں آکر چائے بنانے لگی۔ جب کہ دھیان مسلسل مٹی اور آنٹی کی طرف تھا کہ پتہ نہیں وہ کیا باتیں کر رہی ہیں۔ پھر چائے لے کر اندر آئی تو آنٹی اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”بتاؤں گی کبھی بس ابھی جو جی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں واقعی ہار گئی تھی۔“ اس کے اندر دور تک سناٹا پھیل گیا اور آنکھوں میں اس روانی سے پانی اتر اتر کہ ہر طرف دھند چھا گئی۔ کاش وہ سچ مچ ہار جاتی اور سزا کے طور پر منو بھائی سے شادی کر کے بھی اسے اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا دکھ دوستی کا مان ٹوٹ جانے پر ہو رہا تھا۔

”ابھی بتاؤ ناں۔“ رازی غالباً تجسس میں جھٹکا ہو کر اصرار کر رہا تھا اور اس سے پہلے کہ گل بتاتی وہ دھند میں راستہ ڈھونڈتی ہوئی برآمدے میں نکل آئی۔ ستون کے پاس رک کر آنکھیں صاف دیکھ رہی تھی کہ منو بھائی پر نظر پڑی جو حسب معمول پودوں کو پانی دے رہے تھے۔ وہ جانے کس خیال کے تحت ان کے پاس چلی آئی۔ سلام کیا تو انہوں نے جواب دینے کے ساتھ پوچھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“

”جی..... ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔“ انہوں نے ایک لحظہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر بظاہر اپنے کام میں مصروف ہو گئے تو وہ قدرے رک کر بولی۔

”منو بھائی وہ آپ کے دل پر پڑنے والی پہلی چوٹ کیا تھی۔“ انہیں شاید اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ جب ہی چونک کر دیکھا۔ بہت ٹوٹی ہوئی شکستہ سی نظر آ رہی تھی وہ۔ تب نظریں چراتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”آپ کے دل پر بھی چوٹ پڑی ہے کیا؟“

”آپ میری بات کا جواب دیں۔“

”سوری جویریہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں اپنے آپ کو خود سے بھی پوشیدہ رکھتا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے پودوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے وہ کھڑی دیکھتی رہی جب وہ لان کے آخری سرے تک پہنچ گئے تب وہ تیز قدموں سے ان کے پاس آ کر بولی۔

”منو بھائی! آپ لاکھ خود کو اپنے آپ سے پوشیدہ رکھیں مجھ پر آپ کو اپنی ذات کے اسرار واضح کرنے ہوں گے اس لیے کہ زندگی کا بقیہ سفر ہم نے ایک ساتھ طے کرنا ہے۔“

”کیا بات ہے بیٹا گل سے تمہاری لڑائی ہو گئی ہے کیا؟“

”نہیں تو۔“

”پھر تم نے آنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔“

”گل بھی تو نہیں آئی۔“ اس نے بلا ارادہ شکوہ کر ڈالا۔ پھر چائے کا کپ ان کی طرف

بڑھاتی ہوئی بولی۔

”بے فکر ہیں آنٹی میری اور گل کی کبھی لڑائی ہو ہی نہیں سکتی۔“

”مجھے پتہ ہے بیٹا۔“ پھر مٹی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگیں۔ ”اس روز میں یہ سوچ کر

پریشان ہو رہی تھی کہ جب گل قطر چلی جائے گی تو.....“

”گل قطر جا رہی ہے؟“ اس نے چونک کر پوچھا تو وہ مسکرا کر بولیں۔

”ظاہر ہے بیٹا شادی کے بعد وہیں جائے گی۔ کیا تمہیں گل نے نہیں بتایا کہ رازی کے

ساتھ اس کی نسبت طے ہو چکی ہے۔“ اس انکشاف نے اسے اتنا حیران کیا کہ وہ کچھ بول ہی نہیں

سکی۔ پھر اچانک ذہن میں جھکڑ چلنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنے برسوں کی دوستی میں دشمنی کا

رنگ کب اور کیوں شامل ہوا تھا۔ اور یہی پوچھنے وہ اسی وقت گل کی طرف چلی آئی۔

گل اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی ڈرائنگ روم تک آئی تو رازی

کی آواز سن کر دروازے پر ہی رک گئی۔ وہ بہت اصرار سے کہہ رہا تھا۔

”چلو ناں کہیں باہر چلتے ہیں۔“

”نہیں رازی! ابھی میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاسکتی۔“ گل الجھ رہی تھی۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ پہلے بھی مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر جو جی کو

شک ہو گیا تھا بلکہ وہ یقین سے کہہ رہی تھی کہ میں شرط ہار گئی ہوں۔“

”کیسی شرط؟“

”جویریہ۔“ وہ ایک دم سنانے میں آ کر استہکاح سے کہنے لگی تو وہ دل میں اٹھتی میسوں کو دباتی ہوئی بولی۔

”ہاں میں آپ سے شادی کروں گی۔“ وہ جس طرح اچانک سنانے میں آئے تھے اسی طرح فوراً سنبھل کر ذرا سا مسکرائے اور قدرے طنز آمیز لہجے میں پوچھا۔

”کیوں کیا آپ شرط ہار گئیں؟“

”جی۔“ اب کے سنانے میں آنے کی باری اس کی تھی اور وہ اس کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تاسف سے کہنے لگی۔

”میری ذات کے کون سے اسرار جاننا چاہتی ہیں آپ سب کچھ تو واضح ہے آپ پر کہ لوگ خود کو سزا دینے کے لیے میرا ساتھ تجویز کرتے ہیں۔ یہی میرا دکھ ہے۔“

”منو بھائی!“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”ارے میں نے آپ سے کوئی شکوہ تو نہیں کیا۔ بس ایک درخواست ہے کہ آئندہ کبھی جوش میں آ کر کسی حرام نصیب کی طرف اشارہ مت کیجیے گا۔“ وہ دکھ سے کہتے ہوئے لان سے نکل کر اندر جانے لگے تو ان کی بیساکھی کی ٹنگ ٹنگ میں اس کی سسکیاں دب کر رہ گئیں۔

اس نے چاہا کہ انہیں روک کر کہے کہ وہ شرط ہاری نہیں ہے لیکن وہ انہیں دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکی اور وہیں سے بازو پھلانگ کر اپنے گھر آ گئی۔

وہ ایسی نہیں تھی اس نے قصداً کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی تھی پھر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس بات کی سزا مل رہی ہے۔ گل سے دوستی دو چار دن کی نہیں تھی برسوں کا ساتھ تھا اور ایک ذرا سی بات پر جس طرح گل نے برس ہا برس کی دوستی پر چند روز کی محبت کو ترجیح دیتے ہوئے اسے فریب دینے کی کوشش کی تھی۔ اس سے جہاں اس کا دوستی پر سے اعتماد اٹھا تھا اور انتہائی کرب سے دو چار ہو کر وہیں اسے منو بھائی کے دکھ نے بے تحاشا زلایا تھا اور کوئی ایک بات تو تھی نہیں۔ کبھی باہر کی ناراضگی کا خیال، کبھی گل کی بے وفائی اور کبھی منو بھائی کا دکھ اور جیسے ہر بات کا

ماتم کرنے کو وہ تنہا رہ گئی تھی۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ اس نے انجانے میں ایک حرام نصیب شخص کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ وہ نہ صرف اپس کا اشارہ دیکھ چکا ہے بلکہ اس کی باتیں بھی سن رہا تھا تو وہ اسی وقت اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لیتی لیکن اسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال ابھی بھی وہ ان سے معافی مانگنا چاہتی تھی کیونکہ اس کا مقصد ان کی دل آزاری ہرگز نہیں تھا لیکن ان کا سامنا کرنے کے لیے بہت ہمت چاہیے تھی۔

دن میں کتنی بار ارادہ کرتی لیکن حوصلے جواب دے جاتے۔ یوں ہی کتنے دن گزرے۔ اس دوران گل نے ایک بار بھی آ کر نہیں پوچھا کہ وہ کہاں غائب ہے اور وہ گل سے شاکی نہیں تھی۔ کیونکہ شکوہ دوستوں سے کیا جاتا ہے یا پھر دشمنوں سے اور گل سے اب اس کا ایسا کوئی ناتا نہیں تھا۔

اس وقت وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ایک بار پھر خود کو منو بھائی کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ کیونکہ یہ طے تھا کہ جب تک وہ ان سے اپنی نادانی کی معافی نہ مانگ لیتی اسے کوئی لمحہ سکون کا میسر نہیں آ سکتا تھا کہ اتنے دنوں بعد گل کی آمد پر وہ قدرے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ گل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ نہ جانے کیوں اسے اس کی برادرا جیسی سی لگی اس کی مسکراہٹ میں بھی مصنوعی پن تھا۔

”کچھ نہیں آؤ بیٹھو۔“ اس نے بیڈ پر آگے سرکتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کیا ناراض ہو؟“ گل نے بیٹھتے ہوئے اس کے سپاٹ چہرے کو بغور دیکھا اور وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”نہیں میں کیوں ناراض ہوں گی۔“ گل خاموش ہو رہی۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اب کیا بات کرے۔ وہ کچھ دیر تک انتظار کرتی رہی پھر گھٹنوں پر سونڈی نکا کر بولی۔

”سنو میں نے منو بھائی سے شادی کی بات کی تھی لیکن انہوں نے کوئی جواب

”نہیں.....“ گل فوراً بول پڑی۔ ”میں رازی کے پاس نہیں بلکہ منوبھائی کے پاس جاؤں گی جن کی محبت برسہا برس سے نظر انداز کرتی آرہی ہوں۔“

”لیکن گل.....“ وہ پریشان ہو گئی تو گل اس کا ہاتھ دبا کر مسکرائی۔ پھر انھہ کر جانے لگی کہ وہ رُک کر بولی۔

”سنوگل! منوبھائی سے یہ مت کہنا کہ تم ہار کر ان کے پاس آئی ہو۔“

”میں ہار کر ہی جا رہی ہوں جو جی! شرط میں نہیں..... ان کی محبت میں۔“ جانے کیوں اس کی پلکیں نم ہونے لگیں کہ وہ جلدی سے باہر نکل گئی اور وہ کتنی دیر تک ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے مسکرائی اور لابی میں آ کر بابر کا نہر ڈائل کرنے لگی وہ اس کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے ساتھ یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ اس غلطی کے باعث ہی ایک حرام نصیب شخص کی زندگی میں بہار اتر رہی تھی۔

☆☆☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

نہیں دیا۔“ وہ خاموش ہو کر پھر گل کے بولنے کا انتظار کرنے لگی لیکن نہ جانے کیوں وہ چپ تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اونچا کر کے دیکھا اس کی آنکھوں سے ایک قطرے سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”گل۔“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”مجھے معاف کر دو جو جی۔“ اس نے کہا اور منہ میں بند لفاظی اس کے پاس پھینک کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا پہلے اسے چپ کرانے کا سوچا لیکن پھر لفاظی اٹھا کر کھولنے لگی۔ اندر سے تہ شدہ کا غم نکالا اور جلدی جلدی اس پر نظریں دوڑانے لگی۔ رازی کا خط تھا۔

”گل میں تمہاری محبت پر شبہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تمہاری محبت کبھی پائیدار نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ تم نے برسہا برس کی دوستی کا خیال نہیں کیا پھر بھلا میں تم سے کیا توقع رکھوں۔“

اگر تم ایمانداری سے جو یہ کہنے کے سامنے اپنی ہار تسلیم کر لیتیں تو یقیناً، اگر تو میں تمہارے لیے اس لڑکی کے سامنے دامن پھیلا کر تمہیں مانگ لیتا۔ تمہاری خود غرضی کو دیکھتے ہوئے مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں نے انتخاب میں غلطی کی۔“

رازی

اس نے خط ایک طرف ڈال کر روتی ہوئی گل کو دیکھا تو سچ سچ اسے بہت دکھ ہوا۔ دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ کہنے لگی۔

”مجھے معاف کر دو جو جی میں نے تمہارے ساتھ فاول کیا۔ میں ہار گئی تھی پھر بھی.....“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تم.....“ گل ہاتھ نیچے گرا کر اسے دیکھنے لگی تو وہ ذرا سا مسکرائی۔ پھر اس کا ہاتھ تھام

کر بولی۔

”تمہیں رازی سے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ جاؤ اسے بتاؤ کہ.....“

محمد قیوم اعوان کے بے مثال تراجم اور تخلیقات

لاشریک	قیمت 150 روپے
کنٹرول مائنڈ	قیمت 200 روپے
کامیاب بزنس مین بننے	قیمت 300 روپے
طاقت حاصل کرنے کے 48 قوانین	قیمت 400 روپے
انوکھی جنت	قیمت 150 روپے
بیورو کریسی کا زوال	قیمت 200 روپے
میں ایک عام پاکستانی ہوں	قیمت 150 روپے

عمیرہ احمد کے ناقابل فراموش ناول

میری ذات ذرہ بے نشان	قیمت 200 روپے
میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے	قیمت 200 روپے
سحراک استعارہ ہے	قیمت 200 روپے
لا حاصل	قیمت 200 روپے
زندگی گلزار ہے	قیمت 200 روپے

خواتین ناول نگاروں کی تخلیقات

شہرولی کے دروازے	شازیہ چوہدری	قیمت 400 روپے
نکھر گئے ہیں گلاب سارے	شازیہ چوہدری	قیمت 400 روپے
شوخی گفتار	انجم انصار	قیمت 200 روپے
رنگ چاہت کے	انجم انصار	قیمت 150 روپے
حسینوں کے خطوط	انجم انصار	قیمت 200 روپے
مے ڈے	نگہت سیما	قیمت 180 روپے
تریاق	نگہت سیما	قیمت 175 روپے
سارے خواب عذاب	لبنی عروج	قیمت 150 روپے
سایہ گل	زاہدہ پروین	قیمت 180 روپے
سو تن کا درد	مہناز عرفان	قیمت 150 روپے

حیران کن انکشافات اور سازشوں کی روداد

ہاں! میں باغی ہوں	مصنف: جاوید ہاشمی
انکشافات	قیمت 600 روپے
طالبان، ملا عمر اور اسامہ	مصنف: انوار ہاشمی
ٹاپ سیکرٹ	قیمت 160 روپے
بین الاقوامی مافیا	مصنف: انہار ہاشمی
	قیمت 125 روپے
	مصنف: رائے اسد کھرل
	قیمت 130 روپے
	مصنف: محمد انیس الرحمن
	قیمت 150 روپے